دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد: ۱۰۸	شوال المکرم - ذی الحجہ ۱۴۴۵ھ مطابق مئی - جون ۲۰۲۴ء	شمارہ: ۵-۶

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند	مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند - ۲۴۷۵۵۴ یوپی

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Web : http://www.darululoom-deoband.com
https://darululoom-deoband.com/urdumagazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

DARUL ULOOM Monthly (Urdu)
R. N. I. No.: 2133/57
Vol. No. 108, Issue No. 5-6, May-June 2024 मई–जून 2024
Published by Maulana Abul-Qasim Numani
Printed by Maulana Abul-Qasim Numani
Editor :- Maulana Mohammad Salman Bijnori
On Behalf of Darul Uloom Grush.
Place of Publication :- Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at: Mukhtar Printing Press Mohalla Bar Ziyaul Haq
Talehari Chungi. Deoband, Saharanpur. U.P.

Rs. 60/=	Annual Subscription Rs. 300/=

Annual by Regd Post. Rs. 550/=

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۱۵۰۰ روپے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۸۰۰ روپے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۸۰۰ روپے

فہرست مضامین

حرف آغاز	مدارس اسلامیہ کے سامنے سنگین چیلنج	محمد سلمان بجنوری	۳
رہنمائی	مدارسِ دینیہ کے لیے لمحہ فکریہ	ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی	۵
//	ذوق انفرادیت-ایک بیماری	محمد طیب حنیف	۴۰
تحقیقی مقالہ	کتب سابقہ پر مولانا عبدالحق حقانی کی کی آراء کا تجزیہ	ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی	۴۶
اصلاح	نماز میں خشوع وخضوع کی اہمیت	مولانا محمد راشد شفیع	۶۴
شخصیات	مولانا عبدالصمد رحمانی: حیات وکارنامے	مولانا غالب شمس قاسمی	۶۷
ذکر رفتگاں	حضرت مولانا حکیم محمد فیض آبادیؒ	مولانا محمد اجمل قاسمی	۸۲
//	حضرت مولانا حکیم محمد فیض آبادیؒ....	مولانا محمد منظور امین قاسمی	۱۰۱
نئی کتابیں	تعارف	مفتی اشرف عباس قاسمی	۱۰۵
		ڈاکٹر مولانا اشتیاق احمد قاسمی	۱۰۹

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- ایک سال کے لیے اگر بذریعہ رجسٹری طلب فرمائیں تو =/540 روانہ فرمائیں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

مدارس اسلامیہ کے سامنے سنگین چیلنج

محمد سلمان بجنوری

مدارس اسلامیہ کا وہ کارواں جس نے دیوبند کی سرزمین سے اپنا سفر شروع کیا تھا اور جس نے برصغیر ہی نہیں، دنیا کے دیگر ممالک کو بھی اپنے نور سے منور کیا اور کروڑوں مسلمانوں کے دین وایمان کے تحفظ میں عظیم کردار ادا کیا، اپنی تاریخ کے تقریباً ایک سو ساٹھ (شمسی اعتبار سے ایک سو اٹھاون اور قمری اعتبار سے ایک سو باسٹھ) برس پورے کرچکا ہے، اس طویل سفر میں بے شمار چیلنجوں کا سامنا کرتے ہوئے یہ کارواں اپنے راستے پر سرگرم سفر رہا اور علم وایمان کی شمعیں جلاتا اور ان کی روشنی بڑھاتا ہوا ایک تابناک تاریخ وجود میں لانے میں کامیاب رہا۔

اس طویل سفر میں چیلنج بہت آئے، سب سے پہلے اپنے قیام اور وجود ہی کا معاملہ ایک بڑا چیلنج تھا کہ اس وقت کی سپر پاور برطانیہ کا ملک پر تسلط تھا، جس سے ان بزرگوں نے لڑائی لڑی تھی اور جس نے اپنے نظام تعلیم کے ذریعہ ہندوستانیوں کو انگریزی قالب میں ڈھالنے کا منظم منصوبہ تیار کررکھا تھا، جس کا سب سے بڑا نقصان مسلمانوں ہی کو پہنچنے کا امکان تھا، اس چیلنج کا مقابلہ جس کامیابی سے کیا گیا وہ بلاشبہ دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور اور اِن مدارس کے بانیانِ عالی مقام کے بے مثال تدبر اور پہاڑوں جیسے اخلاص کا نتیجہ تھا، اس کے بعد بھی ڈیڑھ سو برس سے زائد کی اس طویل تاریخ میں بہت سے چھوٹے بڑے چیلنج آئے، جن کا مقابلہ اللہ کی مدد سے ہوتا رہا اور یہ کارواں چلتا رہا۔

لیکن اس وقت جو چیلنج سامنے آیا ہے، وہ شاید مدارس کی تاریخ کا بدترین چیلنج ہے، جس کا نشانہ مدارس کے مقاصد اصلیہ یا اُن کا وجود ہے۔ بنیادی طور پر اسلام دشمن طاقتیں مدارس کے وجود کا خاتمہ چاہتی ہیں اور اگر ضابطہ میں ان کا وجود برداشت کرنا پڑے تو پھر وہ مدارس کو اُن کے اصل مقصد ومشن سے منحرف کردینے کے لیے کوشاں ہیں، جو درحقیقت وجود ختم کردینے ہی کے مترادف ہے۔

اس مذموم مقصد کے لیے ماحول بنانے کا سلسلہ تو واضح طور پر نائن الیون کے بعد سے جاری

ہے، جس کو سمجھنے کے لیے امریکہ سے لے کر ہندوستان تک سرگرم طاقتوں کی جانب سے مدارس کو دہشت گردی کے مراکز ثابت کرنے کی بدترین مہم کا تصور کر لینا کافی ہے؛ لیکن اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ مدارس کے نصاب اور قرآن وحدیث کی تعلیمات ہی کو دہشت گردی اور عدم برداشت سکھانے اور پھیلانے والا بتایا جارہا ہے اور اس طرح مدارس کو نشانہ بنانے کا جواز پیدا کرنے کی کوشش ہورہی ہے اور ساتھ ہی مدارس کے نصاب کی روح کو بدلنے اور اس کو اسلامی رنگ سے خالی کرنے کے مطالبے یا اس مقصد کو پورا کرنے والے قوانین بنانے کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔

عملی طور پر اس وقت مدارس کے سامنے اس کا جو پہلو فوراً سامنے آگیا ہے وہ مدارس کے بچوں کے لیے عصری تعلیم کا لازمی ہونا ہے، اس کے لیے مدارس میں غور وفکر بھی شروع ہو چکا ہے، بعض مدارس اپنے بچوں کو امتحان دلانے کے لیے خارج میں تیاری کرارہے ہیں اور بعض مدارس اپنے نصاب ہی کی ترتیب اس طرح بنانے کی فکر میں ہیں جس سے یہ قانونی مطالبہ پورا ہوسکے۔

اس صورت حال میں مدارس کی ذمہ داری بہت نازک ہوگئی ہے کہ ایک طرف تو اُن کو اس سرکاری یا قانونی تقاضے کی تکمیل کرنی ہے۔ دوسری طرف اپنے اصل مقصد اور مشن کو پوری طرح محفوظ رکھنا ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت تو شاید نہیں ہونی چاہیے کہ مدارس کا مقصد صرف کچھ لوگوں کو دینی تعلیم سے آراستہ کردینا یا دین دار بنادینا نہیں ہے؛ بلکہ اسلامی علوم کا وہ عظیم الشان ورثہ جو درحقیقت میراث نبوت ہے، اس کے ماہرین وحاملین تیار کرنا ہے جو اس امانت کو پوری طرح محفوظ کرکے اگلی نسلوں تک پہنچاسکیں اور دنیوی نفع نقصان سے بے پروا ہوکر امت کی دینی قیادت کا فریضہ انجام دے سکیں۔ ایسے افراد کی تیاری کے لیے جس یک سوئی کی ضرورت ہے، اُس کو نئے تقاضوں کی تکمیل کے باوجود محفوظ رکھنا، مدارس کے سامنے اس وقت کا سب سے بڑا چیلنج ہے۔ اللہ کرے مدارس اسلامیہ اس کا مقابلہ پوری بصیرت وہمت اور اخلاص کے ساتھ کرسکیں۔

* * *

مدارسِ دینیہ کے لیے لمحہ فکریہ

تحریر: ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی

مدارسِ دینیہ علوم ومعارف کے اِیستادَہ مینار ہیں، تقویٰ کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں اور یہیں سے امتِ مسلمہ کو قرآن وسنت کی صحیح تشریح ملتی ہے۔ مدارس سے فارغ علمائے کرام اور مفتیانِ کرام، امت کو فکری ونظریاتی رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ انھیں مدارس سے امت کو وہ رجال اللہ ملتے ہیں جو مختلف محاذوں پر کام کرتے ہیں؛ تاکہ امت کی بنیادی دینی ضروریات پوری ہوں، نیز یہ علمائے کرام سیاسی، سماجی، ومعاشرتی میدان میں بھی اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ ان مدارس سے حفاظِ کرام، قاری، مفتی، عالم، فقیہ، محدث، مفسر، مبلغ، مناظر، عربی علوم کے ماہر، مصنف، اور دینی علوم کو اپنی اصلی حالت میں اگلی نسل تک پہنچانے والے رجال اللہ پیدا ہوتے ہیں۔ انھیں مدارس سے ہمیں عربی اور اردو ادب کو فروغ دینے والے بے نظیر علمائے کرام بھی ملتے ہیں، انھیں میں تاریخ دان بھی ہیں اور صرف ونحو کے ماہر بھی اور انھیں مدارس سے وہ علمائے کرام بھی تیار ہوتے ہیں جو ہر محاذ پر باطل قوتوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور امتِ مسلمہ کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت میں بھی کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

جب ہم ان مدارس کا تقابل عصری تعلیمی اداروں یعنی کالج ویونیورسٹیوں سے کرتے ہیں تو جو بنیادی خصوصیات ہمیں ان مدارس میں نظر آتی ہیں، وہ تقویٰ، اخلاص اور للّٰہیت ہے۔ ان خصوصیات کا حصول طلبائے کرام مدارس کے مُتَّقیانہ ماحول میں کئی سال گزارنے کے بعد حاصل کرتے ہیں حتیٰ کہ مدارس میں مطبخ میں بھی متقی لوگوں کو کھانا پکانے کی ذمہ داریاں تفویض کی جاتی ہیں؛ تاکہ طلبائے کرام کو جو کھانا ملے ان میں اُن کے ذکر کے انوار شامل ہوں۔ بعض مدارس میں کھانا بناتے وقت قرآن پاک کی تلاوت کی جاتی ہے؛ تاکہ کھانا بھی نور بن کر ان طلبائے کرام کو مزید تقویت دے اور روحانی ترقی کا ذریعہ بنے۔ بعض فاضل علمائے کرام مشائخ کے ساتھ صحبت اختیار کرتے ہیں اور سلوک واحسان کے درجات طے کرتے ہیں اور مشائخ سے فیض حاصل کرنے کے بعد امت کی باطنی اصلاح میں مصروفِ

عمل ہوجاتے ہیں۔ بعض علمائے کرام دعوت وتبلیغ کی محنت میں جڑ کر اپنی زندگی دین کی محنت میں صرف کردیتے ہیں، بعض علمائے کرام دینی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے درس وتدریس اور افتاء کے شعبوں سے منسلک ہوجاتے ہیں اور بعض اعلائے کلمۃ اللہ اور احیائے سنت کے لیے اپنی زندگیاں کھپا دیتے ہیں۔ غرض یہ تقویٰ، اخلاص، للّٰہیت اور تربیت ظاہر وباطن ہی ہے جو کہ ان مدارسِ دینیہ کا خاصہ ہے۔ اب اگر یہ اخلاص، تقویٰ اور للّٰہیت مدارسِ دینیہ سے عنقا کردی جائے تو عصری علوم کے اداروں سے فراغت حاصل کرنے والوں اور مدارسِ دینیہ سے فارغ علمائے کرام میں کیا فرق رہ جائے گا؟ اور کس طریقے سے ان دینی مدارس سے فارغ علمائے کرام معاشرے میں سدھار پیدا کرسکیں گے؟ اور پھر کس طریقے سے ان دینی مدارس سے فارغ علمائے کرام اسلام اور ملک وملت کو اپنے ذاتی مفادات پر ترجیح دیں گے؟ نیز پھر ان مدارس سے فارغ ہونے والوں میں اور مغربی ممالک کے لادینی عصری اداروں سے دینی اسلامی تعلیم حاصل کرنے والوں میں کیا فرق رہ جائے گا؟

غرض یہ مدارسِ دینیہ ہی ہیں جو کہ دین کو اپنی اصل شکل میں قائم رکھنے میں معاون ومددگار ہیں۔ مسلمانوں کو کمزور اور ختم کرنے کے لیے باطل کی چالوں میں سے ایک چال یہ ہے کہ کسی طریقے سے مدارسِ دینیہ کو کمزور اور ختم کردیا جائے۔ باطل قوتوں کا زور اس بات پر ہے کہ مدارسِ دینیہ خدانخواستہ کچھ اس شعر کی مصداق ہوجائیں کہ بقول شاعر ؎

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ!

راقم کا یہ مضمون مدارس میں ہونے والے ارتقاء سے متعلق ہے جس کو راقم نے اپنے مدارس سے متعلق کئی سال سے زیادہ کے مشاہدات اور تَعامُل میں محسوس کیا۔ راقم نے مدارس سے باضابطہ تعلیم تو حاصل نہیں کی ہے؛ البتہ مدارس، علمائے کرام اور مفتیان کرام سے گہرا تعلق اور قلبی لگاؤ ہے۔ اس مضمون میں ارباب مدارس اور اکابرین امت کی خدمت میں راقم بحیثیت کمپیوٹر سائنسدان، جو کہ مدارس کے نظام کو باہر سے دیکھ رہا ہے اور اپنے تاثرات ومشاہدات قلمبند کر رہا ہے، اپنی چند گزارشات بڑے دردِ دل سے پیش کر رہا ہے؛ تاکہ اکابرین مدارس، مدارسِ دینیہ کی ظاہری اور باطنی حفاظت کے بارے میں مزید فکر فرمائیں۔ بندہ کو اپنی کم علمی کا احساس ہے اور بندہ سراسر خطا کار ہے، بس اس امید سے یہ کچھ سطور لکھ رہا ہے کہ قارئین لکھنے والے کو نہ دیکھیں گے بلکہ جن اسلاف کی خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن کو دیکھیں گے اور انھیں کا اتباع بھی کریں گے۔ امید قوی ہے کہ بندہ کی

اس جرات، جسارت، کمی کوتاہی آداب کو حضرات علمائے کرام اور اکابرین درگزر فرمادیں گے جزاھم اللّٰہ خیراً احسن الجزا فی الدارین۔

تاریخی طور پر مدارسِ دینیہ کو کمزور اور ختم کرنے کی بے شمار کوششیں ہوتی رہی ہیں اور آج بھی ایسی کوششیں جاری ہیں؛ تاہم اگر ہم مدارس کو ختم کرنے کی کوششوں کا جائزہ لیں تو اُن کی دو بنیادی اقسام ہیں۔اول ظاہری کوششیں ہیں اور دوم خفیہ کوششیں ہیں۔

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی ظاہری کوششیں

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی جو ظاہری کوششیں ہیں ان میں عالمی اِستِعْماری قوتوں کا حکومتِ وقت پر اثر انداز ہوکر ایسی پالیسیاں مرتب کروانا ہوتا رہا ہے جن سے مدارس کو سرے سے ہی ختم کردیا جائے یا کم از کم مدارس اور عوام کے رشتے کو کمزور کیا جائے۔مثلاً موجودہ مدارسِ دینیہ کے رجسٹریشن کے عمل کو پیچیدہ بنانا، نئے مدارس بنانے میں قانونی وانتظامی پیچیدگیاں پیدا کرنا، بار بار مدارسِ دینیہ کو مختلف حکومتی محکموں کے زیرِ اثر لانا، مدارس کو مالی امداد ملنے والے ذرائع جن میں زکوۃ، صدقات وغیرہ شامل ہیں کو کنٹرول کرنا، عِیدُ الْاَضحیٰ کے موقع پر جانوروں کی کھالوں کو مدارس تک نہ پہنچنے دینا سے لے کر میڈیا پر مدارس کے خلاف منظّم پروپیگنڈہ وغیرہ شامل ہیں۔ان ساری باطل کی کوششوں کے سدِباب کے لیے الحمدللہ علمائے کرام کوششیں کرتے آئے ہیں اور اپنی جانوں کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔اللہ پاک ملک بھر کے علمائے کرام کو عمومی طور پر اور خصوصی طور پر مدارس کے گزشتہ اور موجودہ اکابرین کو جزائے خیر دے کہ ان حضرات کی مدارس کو بچانے کی کوششیں لائق تحسین ہیں۔مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی ظاہری کوششوں پر دیگر حضرات نے پیشتر گفتگو فرمائی ہے؛ لہٰذا ہم کوشش کریں گے کہ اس مضمون میں ہم مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوششوں پر تھوڑی تفصیل سے بات کریں۔

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوششیں

مدارس کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوششوں کا مقصد یہ ہے کہ مدارس کو اس کے اصل مقصد سے ہٹایا جائے؛ تاکہ وہاں سے تقویٰ، للّٰہیت اور اخلاص کو سرے سے ختم کردیا جائے۔یعنی پھر مدارس تو رہیں، درس وتدریس بھی ہو، طلبائے کرام بھی رہیں، مفتیانِ کرام بھی رہیں، ''علماء'' اور ''مفتی'' بھی تیار ہوں؛ مگر اُن میں سے وہ تقویٰ، اخلاص، للّٰہیت، دینی پختگی اور تصلّب کی بنیادی روح غائب کردی جائے یا کمزور کردی جائے جو کہ مدارس کا خاصہ ہے۔دیکھیے مدارسِ دینیہ کے مقاصد وموضوع بالکل

واضح ہیں۔حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے بارہا اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ

''ہماری دینی درسگاہوں کا اصل موضوع علوم کتاب وسنت ہیں، انھیں کے افہام وتفہیم، تعلُّم و تعلیم، توضیح وتشریح، تعمیل واتباع اور تبلیغ ودعوت سے ایسے رجال کار پیدا کرنا ہے جو اس تسلسل کو قائم رکھ سکیں، بس یہی ان مدارس کا مقصودِ اصلی ہے''۔(حرفِ آغاز، ماہنامہ دارالعلوم، ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ، مطابق مئی ۲۰۰۷ء)۔

قارئین، آپ بار بار مدارس کے مقصد کو پڑھیے کہ مدارسِ دینیہ کا اصل مقصد کیا ہے۔اب ہم غور کریں کہ مدارس کو ختم وکمزور کرنے کی ظاہری کوششوں کا تو ہمیں کافی حد تک ادراک ہے، وہ ہمیں نظر بھی آتی ہیں اور اس کے تدارک کے لیے ممکنہ تدبیریں بھی اختیار کی جاتی ہیں؛ مگر مدارس کو ختم و کمزور کرنے کی جو خفیہ کوششیں ہیں اُن کو عوامی سطح پر سمجھنے کی اور اُن کے خلاف بھی کافی مضبوطی کے ساتھ کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔اللہ پاک ہمارے اکابرین کو جزائے خیر دے کہ نہ صرف یہ کہ وہ ان ظاہری کوششوں سے بھی واقف ہیں؛ بلکہ وہ خفیہ کوششوں کا بھی پورا ادراک رکھتے ہیں اور اس کے لیے وقتاً فوقتاً تدارک کی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔مدارس کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوششیں کئی جہتوں پر مُحیط ہیں، ہم ان میں سے کچھ کا تذکرہ یہاں پر کرتے ہیں؛ تاکہ عوامی سطح پر حالات کی سنگینی کا احساس ہو اور ہم اس کے تدارک کے لیے مادی اسباب کے ساتھ ساتھ رجوع الی اللہ کو اختیار کریں؛ تاکہ مدارسِ دینیہ کی حفاظت ہو۔

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوشش نمبر۱: نصاب میں جوہری تبدیلی

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوششوں میں سے ایک کوشش مدارس کے نصاب میں جوہری تبدیلی کی ہے؛ مگر الحمد للہ حضرات علمائے کرام اس کی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوئے ہیں۔اس تناظر میں کبھی یہ دعوت دی گئی کہ مدارس سے سائنسدان، انجینئر، ڈاکٹر اور وکیل فارغ ہونے چاہئیں، تو کبھی یہ دعوت دی گئی کہ مدارس کو کمپیوٹر کی تعلیم لازمی دینی چاہیے۔دیکھیے، ضرورت کے درجے میں تو ان عصری علوم کا مدارس میں آنے سے تو کوئی انکار نہیں کرتا؛ مگر بنیادی مقصد ہی سے ہٹ کر مدارس سے یہ توقع رکھنا کہ یہاں سے ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان، محققین، معاشی ماہرین، وکلاء نکلیں گے، یہ بات قطعاً درست نہیں اور مدارس کے مقاصد کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔(مزید تفصیل کے لیے دیکھیے مضمون ''سائنسی تحقیق، عصری علوم، اور دینی مدارس''، ماہنامہ بینات، ربیع الاول ۱۴۴۳ھ نومبر ۲۰۲۱ء)۔

اسی نصاب کی تبدیلی کے حوالے سے ذیل کا اقتباس کافی اہمیت کا حامل ہے۔

''اگلے دن بعد مغرب اسی مدرسے میں ایک مقدس بزرگ شیخ محمد عبدالکریم (حفظہ اللہ) کی زیارت بھی نصیب ہوئی۔ وہ حضرت شیخ امجد الزھاوی رحمتہ اللہ علیہ کے رفقاء میں سے ہیں اور انھوں نے عصری جامعات کے ''ڈگری زدہ'' طریقے کے بجائے قدیم طریقے پر ماہر اساتذہ وشیوخ سے علوم دینیہ کی تکمیل فرمائی ہے۔ ''ماجستیر'' اور ''دکتوراہ'' کے اس دور میں ایسے علماء کی قدر و قیمت پہچاننے والے بہت کم ہیں؛ لیکن سچ تو یہ ہے کہ علمِ دین کی جو خوشبو اور شریعت وسنت کی جو مہک ان بوریہ نشینوں کے پاس محسوس ہوتی ہے، وہ عموماً یونیورسٹیوں کے عالیشان عمارتوں اور ان کے پرتکلف ماحول میں نظر نہیں آتی؛ اس لیے جہاں کہیں جانا ہوتا ہے، ایسے علماء کی تلاش رہتی ہے۔

شیخ موصوف مدرسے کے پہلو میں ایک سادہ سے فلیٹ میں مقیم ہیں۔ قدیم عربی طرز کی نشست، آس پاس کتابوں کے ڈھیر، دروازہ ہر آنے والے کے لیے کھلا ہوا، چہرہ تن گلاب کی طرح متبسم، باتوں میں بلا کی معصومیت، برجستگی اور بے تکلفی، تصنع اور دکھاوے سے کوسوں دور۔ پہلی ہی نظر میں زیارت سے دل باغ باغ ہوگیا۔

ڈاکٹر محمد شریف صاحب (مستشار وزارۃ الاوقاف) نے شیخ کو پہلے سے فون پر ہمارے آنے کی اطلاع کردی تھی، اور شیخ یہ سن کر بہت مسرور تھے کہ ناچیز کو انھیں پرانے طرز کے دینی مدارس اور ان کے علماء سے خادمانہ نسبت حاصل ہے۔ چناچہ ابتدائی سلام وکلام کے بعد ان کا پہلا سوال ہمارے مدارس کے نصاب ونظام سے متعلق تھا۔ اور جب میں نے اپنی درسی کتب میں سے کافیہ، شرح جامی، شرح تہذیب، نورالانوار اور توضیح جیسی کتب کا نام لیا تو وہ تقریباً چیخ پڑے، اور وصیت فرمائی کہ اس قسم کی ٹھوس استعداد پیدا کرنے والے نظامِ تعلیم کو آپ کبھی نہ چھوڑیئے؛ کیونکہ ہم اس نظام کو چھوڑنے کے نتائج بد اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔'' (حضرت مفتی تقی عثمانی مدظلہ، جہانِ دیدہ، صفحہ ۲۲، ادارۃ المعارف، کراچی)

بقول شاعر۔

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین ومروت کے خلاف

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوشش نمبر ۲: انگریزی کا علم

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوششوں میں سے ایک کوشش علمائے کرام کو انگریزی

سکھانے کا خوشنما عنوان ہے جس کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ انگریزی سیکھ کر علمائے کرام دین کی ترویج واشاعت مزید موثر طریقے سے کرسکیں گے۔ ذیل میں ہم کچھ اقتباس نقل کرتے ہیں جس سے ہماری تشویش کو قارئین کو سمجھنے میں سہولت ہوگی:

''مدارسِ دینیہ چونکہ اسلام، اسلامی تہذیب وثقافت، اور امتِ مسلمہ کی چودہ صدیوں کے عظیم الشان دینی اور علمی ورثہ کے امین ہیں، مدارس کی شبانہ روز محنتوں سے اسلام اپنی حقیقی روح وعمل کے ساتھ روئے زمین پر موجود ہے۔ یہ مدارس ہی ہیں جن کی جہدِ پیہم کی وجہ سے آج برصغیر پاک وہند استعمار کی شدید ترین کوششوں کے باوجود ''اندلس'' نہیں بن سکا ہے؛ مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ساٹھ سے زائد مسلمان ممالک اپنے تمام تر وسائل کے باوجود بھی ان استعماری سازشوں کا مقابلہ نہیں کرسکے؛ بلکہ اس پر مستزاد دُکھ دینے والی صورتِ حال یہ ہے کہ اکثر مسلم ممالک استعماری سازشوں کا شکار ہوکر ان کے سامنے گھٹنے ٹیک چکے ہیں؛ چوں کہ مغربی استعماری قوتوں کو اس بات کا بخوبی ادراک ہے کہ ان کے منصوبوں کی تکمیل کی راہ میں آخری رکاوٹ ''دینی مدارس'' ہیں؛ اس لیے ان کا سارا زور اس بات پر ہے کہ کسی بھی طرح سے مدارس کو موجودہ ''دہشت گردی'' کے ساتھ نتھی کرکے اُنھیں راہ سے ہٹا دیا جائے، اگر ایسا نہ ہوسکا (اور یقیناً نہیں ہوسکے گا ان شاء اللہ تعالیٰ!) تو ان کے نصاب میں ایسی تبدیلیاں کروائی جائیں کہ مدارس سے بھی ''لارڈ میکالے'' کے دیے ہوئے نظامِ تعلیم کی طرح انھیں کے پروردہ لوگ نکلیں، جن میں دنیا کو حقیقی اسلام سے متعارف کروانے کی صلاحیت مفقود ہو، جو ہر طرح کے جذبہ حریت سے خالی ہوں۔'' (مفتی ابوالخیر عارف محمود، اگر یہ مدارس نہ رہے تو!، ماہنامہ بینات، محرم الحرام ۱۴۳۸ھ، نومبر ۲۰۱۶ء)

اکبرالہ آبادی مرحوم کا مشہور شعر ہے، بقول شاعر۔

مشرقی تو سر دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

''حاصل یہ ہے کہ مغربی ذہنیت یہ ہے کہ اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو زیر کرنے کے لیے تیغ و سنان کے بجائے، تعلیم کے نام پر دماغوں اور مزاجوں کو بدل دیتے ہیں اور اپنے نظریات وخیالات کے مطابق انکو ڈھال لیتے ہیں، میں اوپر اس نظامِ تعلیم کے بانی ''لارڈ میکالے'' کی تصریح نقل کرچکا ہوں کہ وہ اس نظام سے ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا چاہتا تھا جو رنگ ونسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو؛ مگر مزاج اور فکر اور نظریات وخیالات کے لحاظ سے انگریز ہو، کیا اس کے بعد بھی کسی کو ہماری بات کی

صداقت میں شک و شبہ کی گنجائش ہے؟۔'' (ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ ۷، جلد:۸۹، جمادی الاوّل، جمادی الثانی ۱۴۲۶ ہجری مطابق جولائی ۲۰۰۵ء)

یعنی اگر ہم اوپر کے اقتباس میں تھوڑی تبدیلی کریں تو اب باطل قوتیں، مدارس کے اندر اپنی خفیہ کوششوں کو بُروئے کار لاتے ہوئے ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا چاہتی ہیں جو اپنے ظاہری حُلیے کے اعتبار سے تو ''عالم'' اور ''مفتی'' ہوں؛ مگر مزاج، فکر اور نظریات وخیالات کے لحاظ سے لادینی ہو اور دَر پَردَہ مدارس کے نظام کے اندر رہتے ہوئے اور ''مولانا''، ''مفتی'' کے ٹائٹل استعمال کرتے ہوئے مدارس کے نظام کو گھن کی طرح کھوکھلا کردیں۔ بقول شاعر ؎

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد اس کے بدن سے نکال دو
فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کے غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

''اس مقصد کے حصول کے لیے سب سے آسان اور بہتر راستہ ایسا نظام تعلیم جاری کرنا تھا، جو مسلمان نوجوانوں کے دل ودماغ سے دینی روح، جذبۂ اسلامی اور فکر اسلامی کو یکسر ختم کردے اور ان میں ایسا مادی نقطۂ نظر پیدا کردے جو انھیں مادی زندگی کا رسیا اور عارضی وفانی زندگی کا دلدادہ بنادے، خود اعتمادی جاتی رہے، اور شک وریب میں مبتلا ہوجائے۔'' (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، نقوشِ اقبال، صفحہ ۱۳۰)

دیکھیے، ہم قطعاً انگریزی زبان ضرورت کے درجے میں سیکھنے کے مخالف نہیں ہیں؛ مگر جو ہماری تشویش ہے وہ یہ کہ انگریزی سیکھنے کے عنوان سے کہیں ہم لاشعوری طور پر باطل کے ہاتھوں میں نہ چلے جائیں اور اس طرح مدارس کے مقاصد کو نقصان نہ پہنچے۔ عصری تعلیمی اداروں کا تو حال کچھ ایسا ہے کہ بقول شاعر ؎

کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار
ہوگئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بے زار

مگر کیا یہی کچھ ہم مدارس میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہمارے مدارس طرزِ سلف سے بے زار ہوجائیں؟ میں نے کئی علمائے کرام سے باتیں کی ہیں تو مجھے عجیب تشویش محسوس ہوئی کہ جن نوجوان

مفتیانِ کرام نے انگریزی پڑھ لی ہے تو ان کے اندر میں نے بات کی تردید کرنے کے انداز میں تکبُّر، تعلّی، تفوُّق محسوس کیا اور جن علمائے کرام نے انگریزی نہیں پڑھی، ان کے اندر میں نے تواضع اور عاجزی محسوس کی، میری بات کو انھوں نے سمجھنے کی کوشش کی اور مجھ سے بہت سے سوالات کیے اور پھر انھوں نے میری بات کو مانا بھی اور تسلیم بھی کیا اور ان کے اندازِ گفتگو میں عاجزی کا عنصر تھا اور دوسری طرف ایسے علمائے کرام جو انگریزی سیکھے ہوئے ہیں اور جنہوں نے پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے اور ''ڈاکٹر'' کا ٹائٹل اپنے ساتھ لگا لیا ہے، ان سے بھی میں نے باتیں کیں؛ مگر ان کے انداز سے مجھے محسوس نہیں ہوا کہ میرے سے جو ہمکلام ہے وہ کوئی مدرسہ کا بہت بڑا مفتی ہے جس نے قرآن اور حدیث اور بخاری شریف پڑھی ہو۔ یہ میری فیلنگز ہیں اور میں بڑے درد سے کہتا ہوں کہ اہلِ مدارس اس طرف توجہ دیں کہ انگریزی جب سکھائیں تو اس بات کی طرف توجہ فرمائیں کہ ہم آئندہ نسل میں کیا منتقل کررہے ہیں۔ حضرت مفتی عاشق الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مقولہ بھی سنا کہ ''مولوی جب انگریزی پڑھ لیتا ہے تو اس کا دماغ آسمان پر ہوجاتا ہے سوائے مفتی تقی کے۔'' کہ انگریزی پڑھ کر حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ کا دماغ آسمان پر نہیں چڑھا۔ یہ بات اب مجھے اپنی آنکھوں سے نظر آرہی ہے کہ اکابر اور جید مفتیانِ کرام تو انگریزی سیکھ کر بھی عاجزی، تواضع، اور للّٰہیت کے پیکر ہیں اور جب اُن حضرات کے سامنے حق بات رکھی گئی تو انھوں نے اسے قبول فرمایا؛ جب کہ نوجوان مفتیانِ کرام جنہوں نے انگریزی سیکھ لی ہے اور ''ڈاکٹر'' کا ٹائٹل بھی لگا لیا ہے، اُن میں راقم کو یہ صفات نظر نہیں آئیں؛ البتہ چند ایسے بھی تھے جو واقعی اکابر کی طرز پر برقرار تھے ان کے اندازِ گفتگو میں عاجزی انکساری کا عنصر محسوس ہوا۔

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوشش نمبر۳: اسمارٹ فون کا بے دریغ استعمال

موبائل فون (اسمارٹ فون) کا مدارس میں اور خاص طور پر طلبائے کرام میں بے دریغ استعمال بھی مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوششوں میں سے ایک کوشش ہے۔ مدارسِ دینیہ کے طلباء کو پابند کیا جائے کہ وہ موبائل فون سے دورانِ تعلیم اجتناب کریں۔ اس اجتناب کا مقصد ٹیکنالوجی کا انکار نہیں؛ مگر مدارس میں تقویٰ کے معیار کو قائم رکھنا اور طلبائے کرام کو اُن کے اصل مقصد یعنی دینی تعلیم کی طرف پورے انہماک کے ساتھ توجہ دینے کی ایک کوشش ہے۔ اسی تناظر میں حضرت شیخ مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کا طلبائے کرام سے جامعہ دارالعلوم کراچی، آغازِ تعلیمی سال ۱۴۴۴-۱۴۴۵ ہجری کے موقع پر ہونے والا بیان بھی کافی اہمیت کا حامل ہے جس میں اسمارٹ فون کو عظیم بلا گردانا گیا

ہے اور خاص طور پر طلبائے کرام کو دورانِ تعلیم اس سے دور رہنے کی تلقین کی گئی ہے؛ تاکہ وقت کا ضیاع نہ ہو اور تقویٰ کا حصول ممکن ہو سکے۔

موبائل فون (اسمارٹ فون) کی ظاہری و باطنی تباہ کاریوں سے کون انکار کرسکتا ہے۔ مغربی ترقی یافتہ ممالک کے اندر بھی جو سائنسدان، محققین، اور پروفیسر حضرات سنجیدگی سے کام کرتے ہیں اور سائنس کی دنیا میں اپنا نام پیدا کرتے ہیں وہ بھی موبائل فون سے عملاً دور رہتے ہیں اور اپنے تحقیقی اور سائنسی کام پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور بقدرِ ضرورت موبائل فون کو استعمال کرتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کی ترقی کا راز یہ نہیں ہے کہ وہ موبائل فون میں اس حد تک منہمک ہوگئے ہیں کہ چوبیس گھنٹے اسی میں لگ گئے ہیں۔ ہرگز ایسا نہیں ہے؛ بلکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ دنیا کے نامور محققین، سائنسدان، اور علمی شخصیات کا پورا ایک نِظامُ الاوقات مرتب ہوتا ہے اور اُسی کے تحت وہ اپنی پوری زندگی گزارتے ہیں اور یہی کچھ ہمارے علمائے کرام بھی بتلاتے ہیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ طلبائے کرام تو موبائل فون کے اس فتنے میں پڑ ہی گئے تھے، اچھے اچھے علمائے کرام بھی ہر وقت موبائل فون کے ساتھ لگے ہوتے ہیں اور بہت ہی زیادہ سوشل میڈیا کو استعمال کرنے لگ گئے ہیں جن میں کئی مفاسد ہیں۔ نیز سوشل میڈیا پر ہونے والے گناہوں سے بچنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ میوزک، نامحرم کی تصاویر، جاندار کی تصاویر، وقت کا ضیاع، اور سیاسی وغیر فائدہ مند مواد سے بچنا تقریباً ناممکن ہے۔ لہٰذا اگر ہمیں مدارسِ دینیہ کے تقویٰ کو قائم رکھنا ہے تو موبائل فون کو مدارس سے بالکل دور رکھنا ہوگا۔

راقم جب فرانس میں پی ایچ ڈی کرنے گیا تو وقت میں برکت کے لیے علمائے کرام سے مشورہ کیا تو انھوں نے ارشاد فرمایا کہ موبائل فون اور سوشل میڈیا سے بالکل دوری اختیار کرلو اور صرف اپنے تحقیقی کام پر فوکس کرو۔ الحمدللہ، حضرات مفتیانِ کرام کی بات پر عمل کرنے سے بہت فائدہ ہوا اور نہ صرف یہ کہ پروفیسر حضرات میری تحقیقی کارکردگی پر خوش ہوئے؛ بلکہ مجھے پی ایچ ڈی میں سب سے اعلیٰ ڈگری کا ایوارڈ بھی ملا جسے فرنچ زبان میں Tres honorable یعنی ویری آنرایبل کا اعزاز کہا جاتا ہے۔

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوشش نمبر۴: علمِ معاشیات کی آڑ میں علماء راسخین کی تحقیر

ایک اہم خفیہ کوشش مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی علمِ معاشیات کی آڑ میں علماء راسخین کی تحقیر کے عنوان سے ہے۔ اس کوشش کے ذیل میں نوجوان مفتیانِ کرام کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے اور وہ یوں سمجھ رہے ہیں کہ علمِ معاشیات میں روایتی مدارس کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں اور ان کا کسی درجے میں کوئی ذکر نہیں۔ قارئین حیران رہ جائیں گے کہ جب راقم نے خود ایسے نوجوان

مفتیانِ کرام سے بات کی جو یہ کہہ رہے تھے کہ فلاں خیبر پختونخواہ کے مدرسے والوں کی کوئی حیثیت ہی نہیں اور فلاں کراچی کے بڑے مدرسے کی کوئی حیثیت ہی نہیں؛ کیونکہ ان کو تو جدید معاشیات کی ہوا بھی نہیں لگی۔ یعنی اتنے بڑے بڑے مدرسے، جہاں ہزاروں طلباء ہوتے ہیں، کیا ان لوگوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے؟ کیا وہ معاشیات کو کچھ نہیں سمجھتے؟ ان نوجوان مفتیانِ کرام نے تھوڑی بہت انگریزی کیا پڑھ لی ہے کہ ساری معاشیات یہ سمجھ گئے ہیں اور وہ جو ہدایہ اور احادیثِ مبارکہ کی کتب میں کتاب البیوع پڑھتے پڑھاتے ہیں تو اُن حضرات علماء راسخین سے متعلق یہ نوجوان مفتیانِ کرام کہتے ہیں کہ ان کو معاشیات کی کچھ خبر نہیں۔ یعنی جن علماء نے انگریزی نہیں پڑھی ان کے بارے میں یہ نوجوان مفتیانِ کرام سمجھتے ہیں کہ ان کو معاشیات کی شُد بد بھی نہیں ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جب انھیں انگریزی پڑھے ہوئے نوجوان مفتیانِ کرام کو عالمی معاشی ماہرین کی سائنسی تحقیقات کی طرف متوجہ کیا جائے تو وہ اس کو بھی نہیں مانتے۔ نیز تھوڑی بہت انگریزی جاننے والے نوجوان مفتیانِ کرام کی خود اپنی سائنسی علوم و معاشیات پر گرفت اور استعداد نہایت کمزور ہے۔ یہ نوجوان مفتیانِ کرام نہ جانے کس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ انگریزی میں دو چار مقالے غیر معیاری سائنسی جرائد میں چھاپ کر اور ''ڈاکٹر'' کا ٹائٹل ساتھ لگا کر بس سمجھنے لگتے ہیں کہ وہی اب سب کچھ ہیں۔ یعنی بزبانِ حال وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ سارے مدارس پرانے وقتوں کے ہیں نعوذ باللہ۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کو راقم قارئین کی نظر کرنا چاہتا ہے؛ تاکہ اس سوچ کی نفی کی جائے اور مدارس کو اس شدید خفیہ فتنے سے بچایا جائے۔

دیکھیے مصر و شام سے سارا علم دین ختم ہوا، وہ کیوں ختم ہوا؟ وہاں اسی طریقے سے عصری علوم کو اور عصری ادارے والوں کو ترجیح دیتے رہے اور جو پرانے دین دار علماء راسخین تھے ختم ہوتے رہے۔ ساری دنیا میں اسی طریقے سے باطل نے اپنے پنجے گاڑے۔ اللہ کا شکر تھا کہ ابھی تک پڑوسی ملک میں یہ پنجے گاڑ نہیں سکے تھے؛ مگر اللہ خیر فرمائے، اب انھوں نے یہاں پر اپنے پنجے گاڑنا شروع کیے ہیں اور ان کو مدارس کے اندر سے ہی ایسے لوگ مل گئے جو کہ علماء راسخین کو اہمیت نہیں دیتے۔ یعنی جو علمائے کرام ساری زندگی کتاب البیوع پڑھنے پڑھانے پر لگا دے تو اُن کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کو معاشیات کی ہوا بھی نہیں لگی۔ جب یہ ذوق بن جائے گا تو پھر اللہ ہی حفاظت فرمائے، یہی تو باطل کی سازشیں ہمیشہ سے چلی آرہی ہیں۔

اسی تناظر میں ایک اہم بات قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔ ہمارے اکابرین حضرات ابھی تک الحمدللہ ایسے نوجوان مفتیانِ کرام کی راہ میں رکاوٹ ہیں جن کے اذہان تبدیل

ہو چکے ہیں اور جو روایتی مدارس اور علماء راسخین کو مدارس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ راقم کی بذاتِ خود ایسے نوجوان مفتیانِ کرام سے بات ہوئی اور اپنے کانوں سے سُنا کہ ان میں سے بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہ جو بڑے اکابر بیٹھے ہوئے ہیں یہ ہمیں آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ ایک معتبر صاحب نے اسی سے ملتی جلتی بات ذکر کی کہ اُن کو حضرت مولانا سعید احمد جلالپوری شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن دفترِ ختم نبوت میں یہ بات بتائی تھی کہ اللہ حفاظت فرمائے، حضرت شیخ صاحب (حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ) کا سایہ سلامت رہے، شیخ صاحب چلے گئے تو پھر پتہ نہیں یہ لوگ کیا کچھ کر جائیں گے۔ اللہ پاک خوب جزائے خیر عطا فرمائے ہمارے اکابرین کو کہ جنہوں نے اُمت کو پہلے ہی ایسے تمام فتنوں کے بارے میں اپنی دینی فراست اور دور اندیشی کے ذریعے آگاہ کر دیا۔

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوشش نمبر ۵: کچھ صاحبانِ علم کا کسی مسئلہ میں پارٹی بننا

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوششوں میں سے ایک کوشش یہ ہے کہ علمائے کرام اور مفتیانِ کرام کا مفاد ہی کسی مسئلہ سے وابستہ کر دیا جائے۔ یعنی بعض مرتبہ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک کمپنی ہے اور اس نے کوئی پروڈکٹ یا سروس لانچ کی ہے اور اس کو شریعت کے دائرے میں لانا ہے اور اس صورت میں حضرات مفتیانِ کرام اس کمپنی کے شریعہ ایڈوائزری بورڈ کے ممبر بن جاتے ہیں۔ اب صورتحال یہ ہوتی ہے کہ بعض مرتبہ کچھ مفتیانِ کرام کو اس سائنسی موضوع کی گہری معلومات ہوتی نہیں اور کمپنی کے مالکان الٹی سیدھی معلومات مفتیانِ کرام کے سامنے رکھ کر اپنی کمپنی کی پروڈکٹ اور سروس سے متعلق جواز کا فتویٰ حاصل کر لیتے ہیں، الا ماشاء اللہ۔ اس کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔ دیکھیے اگر حاضر جج خود ہی وکیل بھی بن جائے تو کیا اس کا اثر نہ ہوگا یا کسی ایسے کیس کو دیکھے جس کا تعلق اس کی ذات سے براہ راست ہو تو کیس پر اس کا کیا اثر ہوگا؟ لہٰذا مفتیانِ کرام جب شریعہ ایڈوائز بنتے ہیں تو بہت احتیاط اور ہمت کی ضرورت ہے۔ ہر کسی کے بس کی بات نہیں کہ وہ حضرات اکابرین کی طرح اصولوں پر سمجھوتہ ہونے کی صورت میں استعفیٰ دے دے۔ لہٰذا اس سلسلے میں ہماری دو گزارشات ہیں۔ اول یہ کہ تحقیق کے عنوان پر اور کمپنیوں کو اسلامی اصولوں کے تحت چلانے کے لیے مفتیانِ کرام کو پارٹی بننے سے بچایا جائے۔ دوم یہ کہ اگر ایسا ہو کہ مفتیانِ کرام خود اس مسئلے میں پارٹی بن جائیں تو اکابرین مفتیانِ کرام یہ فرماتے ہیں کہ ایسے مفتیانِ کرام سے، جن کا مفاد خود اس مسئلہ سے وابستہ ہو، عوامی سطح پر مسئلہ پوچھنے اور رائے طلب کرنے سے بھی گریز کیا جائے۔ یہ بات سائنسی علمی دنیا میں بھی مدِنظر رکھی جاتی ہے اور اسے کانفلکٹ آف انٹرسٹ Conflict of Interest کہا جاتا ہے۔

ایک اور مثال سے اس مسئلہ کی سنگینی کو سمجھتے ہیں۔فرض کریں کہ حکومتِ پاکستان نے ایک شریعہ کمیٹی بنائی جس کا کام یہ طے ہوا کہ اس نے پاکستان کے تمام ہوٹلوں کو اس بات کا پابند کرنا ہے کہ وہ شراب کی خرید وفروخت نہ کریں اور نہ ہی ان ہوٹلوں میں شراب صارفین کو دی جائے جو کہ وہاں پر قیام وطعام کرتے ہیں یعنی اس شریعہ کمیٹی کی ذمہ داری شریعہ کمپلائنس کرنا ٹھہری جس کے ذمہ اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ پاکستان کے تمام ہوٹلز مکمل طور پر شرعی قوانین کے ہم آہنگ ہوں یا آسان الفاظ میں شراب کی خرید وفروخت سے اجتناب کریں۔اب اگر اس شریعہ کمیٹی کے چیئرمین کسی شراب کی کمپنی میں شریعہ ایڈوائزی بورڈ کے بھی ممبر ہوں یا اُن کی ذاتی رائے یہ ہو کہ شراب کو کچھ شرائط کے ساتھ جائز ہونا چاہیے تو کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے؟ کیا ان کا اس کمپنی میں شریعہ بورڈ ممبر ہونا یا ان کی یہ ذاتی رائے رکھنا، اس شریعہ کمیٹی کی بنیادی ذمہ داری یعنی شریعہ کمپلائنس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گی؟ بادیٔ النّظر میں تو بہت ہی مشکل لگتا ہے کہ ایسے مفتیانِ کرام پارٹی بھی بنیں اور اُن کا پارٹی بننا ان کے شریعہ ایڈوائزی بورڈ کی ذمہ داریوں سے متصادم بھی نہ ہو، الا ماشاء اللہ۔

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوشش نمبر۶:

مسائل کا متبادل حل دینے کی آڑ میں اپنے دائرہ کار سے نکلنا

مدارس کو کمزور کرنے کے سلسلے میں نوجوان علمائے کرام کی ایک ذہن سازی یہ کی جارہی ہے کہ مسائل کا متبادل حل دینا علمائے کرام کی لازمی ذمہ داری ہے۔دیکھیے اس میں تو دورائے نہیں کہ متبادل ہونا چاہیے اور بتانا بھی چاہیے اور بعض جید مفتیان کرام مسائل کا جواب دیتے وقت متبادل بھی بتادیتے ہیں اور سائل کو نصیحت بھی فرمادیا کرتے ہیں اور ان حضرات میں ہمارے محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری قدس سرہ، حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ قابلِ ذکر ہیں؛ مگر متبادل حل دینے کی آڑ میں ناجائز کو جائز تو قرار نہیں دیا جاسکتا۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ متبادل نصوص کے احکامات کے ذیل میں ہونا چاہیے۔یعنی مثلاً شراب حرام ہے، زنا حرام ہے، سُود حرام ہے تو کیا مسلمان مفتیانِ کرام کے ذمہ فرض ہے کہ وہ زنا، شراب، اور سُود کا متبادل دیں؟ بھئی متبادل تو شریعت نے پہلے ہی سے بتادیا ہے۔مثلاً زنا کا متبادل نکاح ہے، شراب کا متبادل دودھ یا کسی پھل کا جوس ہے، اور سُود کا متبادل کاروبار ہے؛ مگر متبادل ڈھونڈتے وقت یہ کہنا کہ نہیں ہمیں ہر حال میں متبادل دینا ہے اور شریعت کے اصولوں کو بالائے طاق رکھنا ہے کسی صورت بھی مناسب نہیں۔مثلاً سُود کا متبادل دیتے وقت سُود ہی کی کسی نئی شکل کو جائز قرار

دینا کسی صورت میں قابلِ قبول نہ ہوگا۔شراب کا متبادل دیتے وقت کسی نئی قسم کی شراب ہی کو جائز قرار دے دینا کسی طرح قابلِ قبول نہ ہوگا۔آپ ہی انصاف فرمائیے کہ کیا اس طرح کے متبادل قابلِ قبول ہوں گے؟نہیں، ہرگز نہیں! لہٰذا متبادل کی تلاش میں مسلمان مفتیانِ کرام پر ہرگز یہ لازم نہیں کہ وہ زبردستی حرام اور ناجائز چیزوں کو جائز وحلال بتلائیں۔

اسی تناظر میں ذیل کا اقتباس بہت اہم ہے۔

''بہرحال ہمارے ملک میں بڑی ضرورت ہے کہ فقہ اسلامی کی جدید تدوین کے ذریعہ جو قرآن وسنت اور حضرت حق جل ذکرہ اور حضرت رسول اللہ ﷺ کے منشا کے مطابق صالحین کے موروثہ اثاثہ کی روشنی میں کی جائے، جدید پیدا شدہ مسائل کا حل تلاش کر کے فیصلہ کر دینا چاہیے؛ تاکہ دینِ اسلام کا مضبوط اور حسین وجمیل قلعہ قیامت تک اعداء اور اغیار کے حملوں سے محفوظ رہے، مشکل سب سے بڑی یہ ہے کہ ہم یورپ کے جدید معاشی واقتصادی نظام اور معاشرتی نظام کو پہلے ہی اپنا لیتے ہیں اور پھر چاہتے ہیں کہ جوں کا توں یہ پورا نظام اسلام کے اندر فٹ ہو جائے، یہ کیسے ممکن ہے؟'' (دینی مدارس کی ضرورت اور جدید تقاضوں کے مطابق نصاب ونظامِ تعلیم، انتخاب از مقالات محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری قدس سرہ، جمع وترتیب محمد انور بدخشانی صاحب، صفحہ ۱۴۲)

متبادل دینے کی آڑ میں بعض صاحبانِ علم خَلطِ مَبحث کر چکے ہیں۔دیکھیے متبادل کی ایک بڑی وسیع تعریف ہوسکتی ہے۔اگر شرعی تکییف کر کے یہ بتا دیا جائے کہ سُود حرام ہے اور آپ سُود سے بچیں، تو یہ تو حُکم بتانے کے زمرے میں آتا ہے۔اگر یہ بتا دیا جائے کہ آپ سُود کے بدلے تجارت کرلیں تو یہ متبادل دینا کہلائے گا؛ مگر اگر متبادل دینے سے مُراد مسائلِ جدیدہ میں یہ ہے کہ حضرات علمائے کرام اپنے دائرہ کار سے ہی باہر نکل کر کام کریں تو یہ ہرگز مناسب نہ ہوگا۔اس کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔فرض کریں کہ ایک دوا ہے جس کو بنانے میں خنزیر یعنی سور کے خلیے استعمال کیے گئے ہیں۔اب اس کا حُکم بتاتے وقت یہ کہا جائے کہ اس کو استعمال کرنا منع ہے تو یہ حُکم بتانے کے زمرے میں آئے گا، جیسا کہ درجِ ذیل ہے۔

''کسی بھی حرام چیز کو بطورِ دوا استعمال کرنا بھی حرام ہے، الا یہ کہ بیماری مہلک یا ناقابلِ برداشت ہو اور مسلمان ماہر دین دار طبیب یہ کہہ دے کہ اس بیماری کا علاج کسی بھی حلال چیز سے ممکن نہیں ہے اور یہ یقین ہو جائے کہ شفا حرام چیز میں ہی منحصر ہے اور کوئی متبادل موجود نہیں ہے تو مجبوراً بطورِ دوا وعلاج بقدرِ ضرورت حرام اشیاء کے استعمال کی گنجائش ہوتی ہے ورنہ نہیں۔'' (فتوی نمبر: 144110200078 دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن)

پھر اس کا متبادل دے دیا جائے کہ آپ اس حرام اجزاء والی دوا کے بجائے فلاں حلال اجزاء والی دوا استعمال کر لیجیے تو یہ بات بھی عقل میں آتی ہے؛ مگر یہ مفتیانِ کرام کا دائرۂ کار نہیں کہ وہ ہر دوا سے متعلق تحقیق کریں کہ فلاں دوا کا متبادل کون کون سی دوا ہے۔ یہ سائل ہی کے ذمہ ہے کہ وہ حضرات مفتیانِ کرام سے پوچھ پوچھ کر مسلمان ماہر دین دار طبیب سے پوچھ کر متبادل تلاش کرے۔ مسئلہ تب شروع ہوتا ہے کہ جب نوجوان مفتیانِ کرام کی ذہن سازی کی جائے اور اُن کو اس بات کی ترغیب دی جائے کہ آپ خود تحقیق کیجیے اور جدید طبی علوم کو سیکھیے اور پھر سیکھ کر اس حرام اجزاء والی دوا کا متبادل دیجیے۔ یعنی نوجوان مفتیانِ کرام بذاتِ خود ایم بی بی ایس MBBS کریں، پھر ایم ڈی M.D. کریں اور پھر کلینیکل پریکٹس کریں اور طبی دواؤں پر لیبارٹری میں تحقیق کریں اور پھر حرام اجزاء والی دوا کا متبادل دیں۔ یعنی مدارسِ دینیہ کے اندر طب کی تحقیق سے متعلق شعبے قائم ہوں جس کے اندر اس مسئلے پر تحقیق کی جائے اور امت کو نئی دوا بنا کر اس حرام اجزاء والی دوا کا متبادل پیش کیا جائے جو کہ امت کی ضرورت کا حل ہو۔ ہماری گزارش ہوگی کہ یہ مسلمان علمائے کرام اور مدارس کی قطعاً ذمہ داری نہیں کہ وہ اس طرح کی تحقیق کریں؛ بلکہ یہ تو ان کے دائرہ کار ہی میں نہیں آتا اور جو صاحبانِ علم اس طریقے کی ذہن سازی کر رہے ہیں ان کو خَلْطِ مَبْحَث ہو چکا ہے۔ اس میں تو کوئی دو رائے نہیں کہ امتِ مسلمہ کو اس حرام اجزاء والی دوا کا متبادل ملنا چاہیے؛ مگر یہ ذمہ داری کس کی ہے؟ اس کا تعین ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو یہ مسلمان حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کا اہتمام کرے کہ مسلمانوں کے لیے حلال اجزاء والی دوا ملک میں درآمد کرے اور عالمی دوا ساز کمپنیوں سے گفت وشنید کرے تاکہ وہ عالمی دوا ساز کمپنیاں مسلمان ممالک میں حلال اجزاء والی دوا ہی بھیجیں۔ اس کے لیے مسلمان ممالک او آئی سی کا فورم بھی متحرک کر سکتی ہیں۔ نیز ملک کے اندر حکومتی حلال کمپنیوں کے ذریعے بھی اس کا حل نکالا جا سکتا ہے۔ اصولی طور پر تو مسلمان ممالک کو سائنس میں اتنی ترقی کرنی چاہیے کہ وہ خود ایسی دوائیاں ملک کے اندر تحقیق کے ذریعے بنائیں اور یہ مسلمان سائنسدانوں اور محققین کا کام ہے کہ وہ ایسی تحقیق کریں جس سے امت کی ضرورت پوری کی جائے۔

ہمارے ملکِ عزیز میں الٹی گنگا بہہ رہی ہے یعنی جو انجینئر، پروفیسر، محققین اور سائنسدان حضرات ہیں، بجائے اس کے کہ وہ عالمی سائنسی تحقیق میں اپنا نام روشن کریں اور اپنے سائنسی شعبے میں مہارت حاصل کر کے پوری دنیا میں اپنا لوہا منوائیں اور امت کو درپیش جدید مسائل کا متبادل سائنسی حل پیش کریں، وہ اپنی ذمہ داریاں تو تندہی سے انجام دے نہیں رہے؛ بلکہ ان ہی میں سے

بعض انجینئر، پروفیسر، محققین اور سائنسدان حضرات دینی مسائل میں اپنی رائے زنی شروع کردیتے ہیں۔ یعنی آپ کو بہت سارے انجینئر، پروفیسر، محققین اور سائنسدان ایسے ملیں گے کہ جن کو اُن کے اپنے سائنسی شعبے میں تو مہارت حاصل نہیں اور وہ دینی مسائل میں عوامی سطح پر فتویٰ دینے شروع کردیتے ہیں اور اپنے آپ کو دینی اتھارٹی گرداننا شروع کردیتے ہیں۔ یہ بالکل غلط روش ہے اور تاریخ اُمتِ مسلمہ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ جو اُمت میں گمراہی پھیلی وہ اسی روش سے پھیلی اور انھیں لوگوں کی دینی کم علمی، کم فہمی اور تکبر سے اُمت نے بڑے بڑے فتنے دیکھیے۔

اُمت مسلمہ میں بعض اِستثنائی مثالیں ہیں جن میں بعض ڈاکٹر، محققین، انجینئر، اور سائنسدانوں ہی کو اللہ پاک نے اتنی مقبولیت سے نوازا کہ جنھوں نے پہلے علمائے کرام، مفتیانِ کرام اور مشائخ کی صحبت اٹھائی اور پھر انھیں حضرات کو خلافت بھی نصیب ہوئی اور پھر انھیں حضرات سے اللہ پاک نے اتنا کام لیا کہ وقت کے بڑے بڑے علمائے کرام نے ان سے فیض حاصل کیا، مثلاً حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے کئی خلفاء دنیاوی شعبوں سے وابسطہ تھے اور دینی اور دنیاوی شعبوں کا حسین امتزاج تھے؛ مگر ان مثالوں سے ہم عمومی طور پر یہ نتیجہ اخذ نہیں کرسکتے اور نہ ہی کرنا چاہیے کہ دین کی تشریح انجینئر، پروفیسر، محققین اور سائنسدانوں کے ذمہ ہے اور نہ ہی عمومی سطح پر اس کا اطلاق کرنا چاہیے کہ ایسی پالیساں مرتب کی جائیں کہ آگے آنے والی نسلوں میں یہ اِستثنائی مثالیں عموم اختیار کرلیں۔

مستند مدارسِ دینیہ کے دارالافتاء میں مختلف موضوعات پر نئے مسائل کی ٹھوس تحقیق ہوتی ہے۔ ٹھوس تحقیق سے مراد یہ ہے کہ اس سائنسی موضوع کے ماہرین سے رجوع کیا جاتا ہے، سائنسی مسئلہ کی ماہیت پر غور کیا جاتا ہے، شرعی تکییف کی جاتی ہے اور پھر کافی غور وخوض اور تحقیق کے بعد اس مسئلہ پر شرعی حُکم بتایا جاتا ہے۔ قرآنِ پاک کی تفسیر ہو یا شریعت کے احکامات بتانا، احادیث مبارکہ سے مسائل کا استنباط ہو یا مختلف احادیث کی تطبیق، عوام کو مسائل کا حکم شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے بتانا ہو یا دینی علوم میں غور وتدبر، یہ سب کام حضرات علمائے کرام کی ذمہ داریوں میں شامل ہیں اور انھیں پر جچتے ہیں کہ وہ اس موضوع کے ماہر ہیں۔

اب اس کے برعکس صورتِ حال پر غور فرمائیے۔ کچھ مدارسِ دینیہ میں بعض صاحبانِ علم یہ ذہن سازی کررہے ہیں کہ آپ خود ہی اس سائنسی مضمون کے ماہر بن جائیں، خود ہی سائنسی موضوع پر تحقیق کریں، اس پر سائنسی مقالے چھاپیں اور پھر اس سائنسی موضوع پر شرعی حکم بتائیے۔ یہ سراسر

غلط سوچ ہے اور غلط طریقۂ کار ہے کہ فتویٰ کی بنیاد سائنسی موضوع کے ماہرین سے رجوع کیے بغیر ہی رکھی جائے اور یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس سے معاشرے میں جدید مسائل کے حوالے سے تشکیک پیدا ہوجاتی ہے اور علمائے کرام کی رائے میں اختلاف کی بنیاد پڑتی ہے؛ کیونکہ ایسے علمائے کرام کی سائنسی بنیاد ہی مضبوط نہیں ہوتی اور وہ سائنسی شعبے کے ماہر نہیں ہوتے اور اپنے تئیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بڑے سائنسدان اور محقق بن گئے ہیں اور انھوں نے ''مفتی'' کے ساتھ ''ڈاکٹر'' کا ٹائٹل بھی حاصل کرلیا ہے؛ لہٰذا اب وہ خود ہی سائنسدان، معاشی ماہر اور محقق بن گئے ہیں۔ راقم نے خود کئی بڑے مستند مدارس اور جید مفتیانِ کرام کے عمل کا مشاہدہ کیا، یہ تمام حضرات الحمدللہ سائنسی شعبے کے ماہرین سے سائنسی مسئلہ کی تکنیکی ماہیت سمجھتے ہیں اور پھر جدید مسائل کا حل امت کو پیش کرتے ہیں۔ تو اس بات کا خلاصہ یہ ہوا کہ ہر ایک اپنے دائرۂ کار میں رہتے ہوئے کام کرے یعنی جو ذمہ داریاں حضرات علمائے کرام اور مفتیانِ کرام کی ہیں وہ اُن پر کاربند رہیں اور جو سائنسدانوں، محققین، پروفیسر اور انجینئر حضرات کی ذمہ داریاں ہیں، وہ اُن ذمہ داریوں کو پوری تندہی کے ساتھ انجام دیں۔ اسی سے معاشرہ اِفراط وتَفرِیط سے بچے گا اور ترقی کرے گا۔

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوشش نمبر ۷:
تحقیق کے عنوان سے جمہور علمائے کرام کی رائے سے ہٹنا

ایک خفیہ کوشش مدارس کو ختم اور کمزور کرنے کی یہ ہے کہ تحقیق کے عنوان سے مدارس کے اندر یہ رجحان پیدا کیا جائے کہ وہ جمہور علمائے کرام کی رائے سے ہٹ کر رائے اختیار کریں۔ اس طریقے سے کئی مفاسد جنم لیں گے مثلاً امت میں افتراق پھیلنے کا خدشہ ہوگا، عوام کا جمہور علمائے کرام سے اعتماد مجروح ہونے کا خدشہ ہوگا؛ کیونکہ عوام تو جس میں خواہش پوری ہو اور مطلب براری ہو اسی چیز کو اختیار کرتے ہیں؛ اس لیے بڑے نامور جمہور مفتیانِ کرام کے فتویٰ کو چھوڑ کر ان کے مقابلے میں عوام ان حضرات کی انفرادی رائے کو لے کر عمل اختیار کریں گے۔ نیز جن مدارس میں جمہور علمائے کرام کی رائے سے ہٹ کر رائے قائم کی جائے گی تو اس پر لامحالہ فتویٰ دینے والے حضرات عمل بھی کریں گے اور نتیجتاً ان حضرات کا بھی مشکوک ومشتبہ معاملات میں پڑنے کا امکان ہوگا۔

ہم ہرگز یہ نہیں کہہ رہے کہ مدارس میں تحقیق کے حوالے سے جمود طاری کردیا جائے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔ دیکھیے مدارس کے نصاب میں جب قرآنِ پاک کی تفسیر پڑھائی جاتی ہے تو شراب کی حلت وحرمت پر تفصیلی بحث کی جاتی ہے، پھر جب احادیثِ مبارکہ کی کتب طلبائے کرام

پڑھتے ہیں تو احادیث کے ذیل میں بھی شراب سے متعلقہ مسائل کا ذکر ہوتا ہے۔ اور پھر جب تفصیلاً فقہ پڑھائی جاتی ہے تو قدوری اور ہدایہ میں شراب سے متعلق بے شمار مسائل پر بحث کی جاتی ہے اور گہرائی میں جا کر شراب سے متعلقہ مسائل کو سمجھا جاتا ہے۔ پھر تخصص میں تو یہ ابحاث اس حد تک آگے چلی جاتی ہیں کہ شراب سے متعلق آئندہ پیش آنے والے مسائل کا نہ صرف یہ کہ مکمل احاطہ کیا جاتا ہے؛ بلکہ شراب کی ماہیت سے لے کر بالکل جدید مسائل میں بھی امت کی رہنمائی کی جاتی ہے جیسے انقلابِ ماہیت یا استحالہ کے مسائل سے لے کر شراب کا دوائیوں میں استعمال وغیرہ۔

مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ العیاذ باللہ، مدارس تحقیق کے نام پر شراب کشید کرنے کے طریقۂ کار ہی مدارس کے طلبائے کرام کو سکھانے لگ جائیں؛ تاکہ وہ اس عمل سے پیسے کمائیں، اگر ایسا ہونے لگ جائے تو آپ اس کو کس چیز سے تعبیر کریں گے؟ اگر مدارس میں شراب کی خرید وفروخت کے آن لائن طریقۂ کار کو تحقیق کے نام پر علمائے کرام ومفتیانِ کرام کو سکھایا جائے تو اس کو کس چیز سے تعبیر کیا جائے گا؟ اگر کسی شراب بنانے والی کمپنی کے پروڈکٹس کی تشہیر ہی مدارس میں شروع کر دی جائے تو اس کو کس چیز سے تعبیر کیا جائے گا؟ اگر نئی ٹیکنالوجی کو مفتیانِ کرام کو متعارف کروانے کی آڑ میں (تاکہ مفتیانِ کرام مسئلہ کی ماہیت کو سمجھ کر اس کی فقہی تکییف کر سکیں) ایسے کورسیز متعارف کروائے جائیں جن میں شراب کی خرید وفروخت اور اس کے ذریعے سے پیسہ کمانے کو نوجوان علمائے کرام کو سکھایا جائے تو اس کو کس چیز سے تعبیر کیا جائے گا؟ اگر ہزاروں نوجوان علمائے کرام کے لیے ٹیلی گرام، واٹس اپ اور فیس بک گروپ بنائے جائیں جن میں ان طلبائے کرام کو آن لائن شراب کی کمپنیوں میں سرمایہ کاری کر کے پیسہ بنانے کا طریقہ سکھایا جائے؛ تاکہ نوجوان علمائے کرام خود کفیل ہو جائیں اور اُن کو ہُنر آ جائے تو اس کو کس چیز سے تعبیر کیا جائے گا؟ یقیناً کوئی بھی دینی غیرت مند تحقیق کے نام پر مدارس میں شراب کی رتی برابر بھی تشہیر اور ترویج واشاعت اور طلبائے کرام اور علمائے کرام کو شراب کی آن لائن خرید وفروخت سکھانے کی تائید نہیں کرے گا۔ تائید تو درکنار، ایسی کسی بھی حرکت کو بَانگِ دُہل گھناؤنا عمل قرار دے کر اس سے بَرائت کا نہ صرف یہ کہ اظہار کیا جائے گا؛ بلکہ ایسے تمام اشخاص اور دینی اداروں کا مکمل طور پر بائیکاٹ بھی کیا جائے گا اور عوام میں شعور وآگاہی پیدا کی جائے گی کہ وہ تحقیق کے نام پر ایسی باتوں میں ہرگز نہ آئیں۔

نیز یہ دلائل بھی امت تسلیم نہیں کرے گی کہ چونکہ شراب کی ماہیت کے حوالے سے ہی علمائے کرام وسائنسدانوں میں اختلاف ہے؛ لہٰذا شراب کی خرید وفروخت کی پشت پناہی کی جائے۔ امتِ

مسلمہ یہ دلیل بھی کبھی تسلیم نہیں کرے گی کہ چونکہ روزنت نئی شراب کے پروڈکٹس بازار میں آ رہے ہیں اور چونکہ شراب کی ماہیت بعض حلقوں میں زیر بحث ہے؛ لہٰذا اس کو جائز قرار دیا جائے۔ یہ دلیل بھی کارگر ثابت نہ ہوگی کہ شراب کو سرکہ بنا کر پیش کیا جائے اور پھر اس کے جائز ہونے کو بیان کیا جائے۔ اگر کوئی اس طرح کرنے کی کوشش کرے گا کہ علمائے کرام اور علمی حلقوں میں تو یہ کہے کہ ہم شراب کے نئے پروڈکٹس کی ماہیت پر قانونی، فقہی، اور عملی جہتوں پر غور کر رہے ہیں اور اس کے بالمقابل عوامی سطح پر انھیں شراب کے پروڈکٹس کی نہ صرف یہ کہ جواز کی تحریک چلائے؛ بلکہ پریس ریلیز کے ذریعے عوامی رائے ہموار کرے اور انگریزی و اردو فتویٰ جات و مضامین لکھے جس میں وہ شراب کے نئے پروڈکٹس کے جواز کا قائل ہو، اس کو بھی امتِ مسلمہ کبھی تسلیم نہیں کرے گی۔

دیکھیے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کون سے مدرسے میں تحقیق کے عنوان سے شراب کو جائز قرار دیا گیا ہے؟ ہم سو فیصد متفق ہیں کہ ایسا ہونا بَعید اَز وَہم وخیال ہے کہ مدارس میں ایسے کسی کام کے بارے میں کوئی ذی شعور شخص سوچے بھی! پھر غور فرمائیے کہ کیوں ہم یہ بات کر رہے ہیں کہ مدارس کو کمزور کرنے کی خفیہ کوشش میں سے ایک یہ ہے کہ تحقیق کے عنوان سے جمہور علمائے کرام کی رائے سے ہٹا جا رہا ہے؟ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بہت سارے ایسے مسائل ہیں جن میں قلیل تعداد میں مدارس کے اندر تحقیق کے عنوان سے ایسی رائے کو اختیار کیا گیا ہے جن کی سائنسی بنیاد کمزور یا غلط ہے اور جس کی وجہ سے مدارسِ دینیہ میں تقویٰ، اخلاص اور للّٰہیت پر اثر پڑے گا۔ یعنی اپنی غلط اور کمزور سائنسی تحقیق کی بنیاد کو نہ صرف یہ کہ صحیح سمجھا جا رہا ہے؛ بلکہ اس پر اصرار کیا جا رہا ہے اور جمہور علمائے کرام کی رائے سے ہٹ کر رائے اختیار کی جا رہی ہے۔ غرض تحقیق کے عنوان سے کچھ ایسی صورتحال پیدا کی گئی ہے، بقول شاعر ؎

خِرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خِرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

کچھ مدارس کے اندر تحقیق کے عنوان سے یوٹیوب پر اشتہارات سے متعلق یہ تاثر دیا گیا ہے کہ یوٹیوب استعمال کرنے والے کو اشتہارات کے دیکھنے نہ دیکھنے پر پورا کنٹرول ہے اور پھر اس کے ذیل میں یوٹیوب کی کمائی کو جائز قرار دیا گیا ہے؛ جب کہ مشاہدہ اور تحقیق سے یہ بات ثابت ہے اور کمپیوٹر سائنسدان بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ ویڈیو بنانے والے کو اس بات کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اپنی مرضی کا اشتہار چلانے پر یوٹیوب کو پابند کرے لہٰذا مستند دارالافتاء سے یوٹیوب کے اشتہارات سے

ہونے والی کمائی سے اجتناب کی بات کہی گئی ہے۔ پھر جب نوجوان علمائے کرام یوٹیوب کی اس مشتبہ کمائی میں لگیں گے تو اس کمائی کا ان نوجوان علمائے کرام کے تقویٰ اور للّٰہیت پر کیا اثر پڑے گا؟ اس کا آپ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔ اسی طریقے سے ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر سائنس سے متعلق دیگر جدید مسائل میں بھی غلط سائنسی تحقیق کی بنیاد پر جمہور علمائے کرام کی رائے سے ہٹ کر رائے اختیار کی گئی ہے۔

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوشش نمبر ۸:
فتویٰ کی بنیاد غیر معیاری و غیر مستند سائنسی مواد پر رکھنا

مدارس کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوشش میں ایک یہ بھی ہے کہ فتویٰ کی بنیاد غیر معیاری و غیر مستند سائنسی مواد پر رکھی جائے۔ اس عمل سے دنیادار طبقہ میں مدارس سے متعلق نفرت جنم لے گی اور وہ یہ تاثر لیں گے کہ مفتیانِ کرام کسی مسئلہ کو بیان کرتے وقت مستند سائنسی معلومات پر انحصار نہیں کرتے۔ مدارس میں تحقیق کے حوالے سے اہم بات یہ ہے کہ کسی بھی سائنسی موضوع پر بات کرنے کے لیے اس سائنسی موضوع کے ماہرین سے اس موضوع کو سمجھا جائے اور اس موضوع کی سائنسی و تکنیکی تفصیلات سمجھنے، پرکھنے اور جاننے کے بعد پھر کوئی اس مسئلہ سے متعلق شرعی تکییف کی جائے۔ ہمارے مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ کچھ مدارس میں مسئلہ کی سائنسی تفصیلات جاننے کے لیے غیر معیاری اور غیر مستند سائنسی مواد پر بھروسہ کیا جارہا ہے۔ نیز سائنس کے بنیادی اصولوں کو بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھا جارہا۔ کچھ مدارس میں نوجوان مفتیانِ کرام اپنے آپ کو ترقی پسند Progressive ظاہر کرنے کے لیے ہر نئے سائنسی مسئلہ پر فتویٰ جاری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ سے یعنی نوجوان مفتیانِ کرام سے کس نے کہا ہے کہ کسی بھی سائنسی موضوع کے خود ساختہ ماہر بن کر ہر نئے سائنسی مسئلہ پر فتوی جاری کریں؟ کس نے آپ سے کہا ہے کہ مسئلہ بتاتے ہوئے، فتویٰ کی تمہید باندھتے ہوئے نوجوان مفتیانِ کرام خود سائنسدان و معاشی ماہر بن جائیں؟ اصولی طور پر ہونا تو یہ چاہیے کہ کوئی نیا سائنسی مسئلہ بتاتے وقت کئی عالمی سائنسی ماہرین سے رجوع کرلیا جائے اور بنیادی سائنسی مآخذ کی مراجعت کر لی جائے؛ تاکہ فتویٰ کی سائنسی بنیاد درست ہو۔ الحمدللہ ہمیں اطمینان ہے کہ مستند دینی مدارس اور دارالافتاء میں سائنسی ماہرین اور متعلقہ شعبے کے ماہرین سے رجوع کیا جاتا ہے، جس چیز سے متعلق مسئلہ بیان کرنا ہوتا ہے، اس کی اصل ماہیت کو سمجھا جاتا ہے اور پھر اس سے متعلق مسئلہ بتایا جاتا ہے؛ مگر کچھ مدارس کا تخصص کے طلبائے کرام کو مُبَیَّنہ طور پر اس منہج پر تربیت دینا کہ کسی بھی سائنسی مسئلہ پر سطحی معلومات، غیر معیاری، غیر سائنسی مواد اور سوشل میڈیا پر موجود مواد کو بنیاد بنا کر

تحقیق کے عنوان سے مسئلہ بتا دینا اور پھر مصدقین دارالافتاء اور مصححین دارالافتاء کا فتویٰ لکھنے والے متخصص کی تحقیق پر اعتماد کرتے ہوئے اس فتویٰ کو جاری کر دینا، یہ مزید تشویش کی بات ہے۔ ہم ہرگز یہ نہیں کہہ رہے کہ ایسا دانستہ طور پر ہو رہا ہے۔ ہماری رائے میں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مدارس میں ایک نئی سوچ پروان چڑھائی جارہی ہے جس کے اندر یہ کہا جارہا ہے کہ مدارس ہی کے طلباء سائنسی موضوعات کے بھی ماہر ہوں۔

ایں خیال است و محال است جنوں

بس یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جہاں پر غلطی ہورہی ہے۔ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ نوجوان مفتیانِ کرام شریعت کے بھی ماہر ہوں اور دنیا کے چوٹی کے سائنسدان بھی ہوں اور اُن کو سائنسی مضامین پر بھی پورا عبور حاصل ہو، الا ماشاء اللہ؟

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوشش نمبر ۹:
مستقبل کے خوف اور طعنوں سے ہرنئی ٹیکنالوجی کو جائز کہنا

مدارس کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوشش میں ایک یہ بھی ہے کہ نوجوان علمائے کرام کے ذہنوں میں یہ بات ذہن نشین کروائی جارہی ہے کہ ڈیجیٹل ورلڈ میں ہرنئی آنے والی چیز کو جائز سمجھو۔ اس تناظر میں خاص طور پر کمپیوٹر سے متعلق جتنی بھی نئی ڈیجیٹل بیسڈ ٹیکنالوجیز آرہی ہیں، یہ نوجوان علمائے کرام سب کے جواز کے قائل ہورہے ہیں۔ یہ کہاں کی منطق ہے کہ جب اُس ڈیجیٹل ٹیکنالوجی سے متعلق سائنسی شواہد اور دلائل سے پتہ بھی چل جائے کہ اس میں شرعی محظور ہیں پھر بھی ضد پر اڑے رہنا اور اس کے جواز کے ہی قائل رہنا؟ اور جب ایسے صاحبانِ علم سے مؤدبانہ طور پر اشکال کیا جائے تو وہ حضرات یہ دلیل دیں کہ اگر ہم ابھی اس کے عدم جواز کے قائل ہوگئے اور اس کو ناجائز قرار دے دیا تو مستقبل میں کیا ہوگا؟ ہمیں لوگوں کے طعنے ملیں گے کہ دیکھو اولاً یہ مفتیانِ کرام ہرنئی آنے والی چیز کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور پھر کچھ عرصے میں اس کے رائج ہوجانے کے بعد اپنے فتویٰ سے رجوع کر لیتے ہیں اور پھر اُسی چیز کو جائز قرار دے دیتے ہیں اور اس کا استعمال بھی شروع کر دیتے ہیں۔ پھر مزید یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگر کسی نئی آنے والی ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کو ہم نے ناجائز قرار دے دیا اور پھر اس کی ماہیت تبدیل ہوگئی اور لوگوں میں اس ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کا اس حد تک رواج ہوگیا کہ اس سے بچنا ہی ناممکن ہوا تو پھر بھی تو ہمیں جواز کی طرف جانا ہوگا؛ لہٰذا ہم کسی بھی ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کے عدم جواز کی رائے نہیں دیں گے، چاہے ابھی اس میں

کتنے ہی شرعی محظور کیوں نہ ہوں۔ حضرات مفتیانِ کرام فرماتے ہیں کہ یہ سوچ ہی غلط ہے؛ کیونکہ جب کوئی مسئلہ بتایا جاتا ہے تو اس کی موجودہ صورت اور ماہیت کو سامنے رکھ کر بتایا جاتا ہے نہ کہ مفروضات کی بنیاد پر کسی مسئلہ کا حکم بتاتے ہیں۔ ہاں جب کبھی مستقبل میں کوئی استثنائی صورت بعد میں پیدا ہوجائے یا چیز کی ماہیت ہی تبدیل ہوجائے تو اسی کے حساب سے حضرات مفتیانِ کرام اس مسئلہ کی مزید وضاحت وحکم ارشاد فرمادیں گے۔

لہٰذا مدارس کے منتظمین حضرات اور خاص طور پر دارالافتاء کے حضرات اس بات کا خیال رکھیں کہ جدید سائنسی مسائل پر ایسے نیوٹرل دنیا کے سائنسدانوں اور معاشی ماہرین کی تحقیقات سے استفادہ کیا جائے جو کہ پروپیگنڈہ کے زیرِ اثر نہ ہوں اور عالمی سطح پر سائنسدان اور معاشی ماہر تصور کیے جاتے ہوں۔ نیز مدارس کی سطح پر ایسے اصول وضوابط بنادیئے جائیں کہ جدید سائنسی مسئلہ سے متعلق تکنیکی تفصیلات اُس شعبے کے عالمی سائنسی ماہر سائنسدانوں سے معلوم کیا جائے جن کو سائنسی دنیا تسلیم کرتی ہے اور ان کا حوالہ اور ان کے نام مقام اور اہلیت بھی ذکر کی جائے تاکہ سائنسی اعتبار سے کوئی بات ادھوری اور نامکمل سامنے نہ آئے اور پھر سائنسی تحقیق کو سامنے رکھ کر اُس سائنسی مسئلہ کا حکم بتایا جائے۔

ہمارے مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ بے تحاشہ نوجوان مفتیانِ کرام اس ذہن سازی سے مرعوب ہوچکے ہیں اور وہ اب یہ برملا کہتے ہیں کہ کسی بھی نئے معاملے کو ناجائز اور حرام قرار دے دینا بہت آسان ہے بالمقابل اس پر غور وخوض کیا جائے اور مسلمانوں کے لیے اس کے جائز ہونے کی کوئی صورت اپنائی جائے۔ دیکھیے، یہ جو ذہن سازی کی بات ہم نے پہلے عرض کی، اس کی جڑیں بہت پرانی ہیں اور اس پر گزشتہ کئی دہائیوں سے کوششیں کی جارہی ہیں۔

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوشش نمبر ۱۰:
مشتبہ ٹیکنالوجی سے پیسہ کمانے کے طریقے علمائے کرام کو سکھانا

مشتبہ ذرائع سے پیسہ کمانے کے طریقے سکھانا بھی مدارس کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوششوں میں سے ایک کوشش ہے۔ راقم خود کئی مدارس کے مطبخ میں گیا ہے جہاں پر کھانا پکاتے وقت قرآن پاک کی تلاوت کا معمول دیکھا۔ اسی طریقے سے شیخ الحدیث رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی سوانح حیات آپ بیتی میں مدارس کے تقویٰ کے کئی واقعات تحریر فرمائے ہیں کہ اکابر کا کتنا سخت اہتمام تھا کہ مدارس کی اصل روح یعنی تقویٰ، للّٰہیت اور اخلاص مدارس میں قائم رہے۔ یہ ہمارے آج کے مدارس کی تاریخ

ہے الحمدللہ۔ ہمارے اسلاف بھی بہت احتیاط فرماتے تھے، حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین، تبع تابعین، اور اولیاء کرام کے واقعات اس بات پر شاہد ہیں کہ وہ تقویٰ اختیار کرتے تھے اور مشکوک سے بھی بچتے تھے۔ اگر کسی چیز کے بارے میں مفتیانِ کرام کی رائے ہو کہ وہ ناجائز ہے اور جوا اور سٹے بازی اور سودی کاروبار کی ایک شکل ہے تو اس سے کم از کم مشکوک سمجھ کر بچنا تو چاہیے، چہ جائیکہ اس کی ترویج واشاعت کی جائے؟ کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ جب کسی مدرسہ کے وسائل کو استعمال کیا گیا ہو، پھر وہاں جُوا اور سٹے بازی سے پیسہ کمانا سکھایا گیا ہو اور پھر وہ کورس کی فیس کی مد میں آنے والا مال مدرسہ میں لگا ہو؟ کیا یہ مال مشکوک نہیں؟ کیا ایسا مال مدرسہ میں لگنا چاہیے؟ اگر کوئی یہ کہے کہ جی مدرسہ میں ایسے کسی کورس کی فیس کا مال نہیں لگا؛ بلکہ جو مُدرس صاحب تھے انھوں نے ہی وہ فیس رکھ لی؟ تو کیا وہ مُدرس اور صاحبِ علم کا مدرسہ سے تعلق نہیں؟ کیا وہ مستقل فتویٰ نویسی کا کام نہیں کرتے؟ دیکھیے، اجتہادی مسائل میں رائے رکھنے کو کسی نے منع نہیں کیا؛ مگر رائے رکھنے کی آڑ میں باقاعدہ ایسے مشتبہ کاروبار کے ذریعے نوجوان علمائے کرام کو اور مدارسِ دینیہ کے طلبائے کرام کو پیسہ کمانا سکھانے کو کس چیز سے تعبیر کیا جائے؟

ہماری مؤدبانہ گزارش اربابِ مدارس سے یہ ہوگی کہ وہ دینی تحقیق اور ہُنر کے عنوان سے مشتبہ ٹیکنالوجیز کو مدارس میں پروان چڑھنے سے روکیں اور پابندی لگائیں۔ جس طریقے سے موبائل فون سے متعلق کہا گیا، اسی طریقے سے مدارس کی حدود میں اس بات کی بھی قطعی اجازت نہ دی جائے کہ وہ مشتبہ ٹیکنالوجیز کی خرید وفروخت کے کورسیز کروائیں یا اس میں سرمایہ کاری کے طریقۂ کار علمائے کرام کو سکھائیں۔ اسی طرح سے مدارس اینڈومنٹ فنڈ Endowment Fund کے عنوان سے صدقات وخیرات کی سرمایہ کاری مشتبہ چیزوں میں ہرگز نہ کریں۔ گو کہ مدارس اس فتنے سے کوسوں دور ہیں؛ مگر اس فتنے کی سرکوبی کے لیے آگاہی بہت ضروری ہے اور اقدامی قدم اٹھانا ناگزیر ہے؛ کیونکہ ہمارے مشاہدے کے مطابق اندر ہی اندر بہت سے نوجوان مفتیانِ کرام کی ذہن سازی ایسی کی گئی ہے کہ وہ کاروبار، جُوا اور سٹے بازی میں فرق نہیں کر پائیں، الا ماشاء اللہ۔

ایک نئی ذہنیت جس کو پروان چڑھایا جارہا ہے وہ یہ کہ مدارسِ دینیہ کے طلباء کو مختلف کمپیوٹر کورسیز کروائے جائیں۔ اب ان میں کچھ ایسے کورسیز بھی ہیں جن میں مشتبہ مال کمانے کا امکان ہے۔ لہٰذا ایک بنیادی نقطہ سمجھ لینا چاہیے کہ مدارس کے طلباء کا کام کمپیوٹر سیکھ کر پیسہ کمانا ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ اس پر سونے پر سہاگہ کہ جو حضرات مدارس میں ان کمپیوٹر کورسیز کی ترویج واشاعت کررہے ہیں وہ یہ راگ

الاپ رہے ہیں کہ ایسا کرنے سے اہلِ مدارس سائنسی دنیا اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اقوامِ عالم سے مقابلہ کرسکیں گے۔ ایسا قطعاً درست نہیں، بھلا کچھ کمپیوٹر کورسیز کروا کر اقوامِ عالم سے سائنس و ٹیکنالوجی میں مقابلہ کیا جاسکتا ہے؟ اس کے لیے تو اُن عصری تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں کو اپنے طرزِعمل پر غور کرنا چاہیے جن کا یہ کام ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اقوامِ عالم کا مقابلہ کریں چہ جائے کہ مدارس کے طلباء کو اُن کے اصل کام یعنی دینی تعلیم سے دور کردیا جائے۔

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوشش نمبر۱۱:

اختلافِ آراء کی آڑ میں مشتبہ ٹیکنالوجیز کی ترویج واشاعت

اسی طریقے سے اختلافِ آراء کی آڑ لے کر مشتبہ ٹیکنالوجیز کی خوب ترویج واشاعت کی جاتی رہی ہے اور ابھی بھی بعض لوگوں کی جانب سے کوششیں جاری ہیں؛ حالانکہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک فقہی ضابطہ لکھا ہے وہ یہ کہ

''جلبِ منفعت سے دفعِ مضرت مقدم ہے، یعنی ایک کام کے ذریعے سے کچھ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے اور ساتھ ہی مضرت بھی پہنچتی ہے تو مضرت سے بچنے کے لیے اس منفعت کو چھوڑ دینا ہی ضروری ہوتا ہے، ایسی منفعت کو نظر انداز کردیا جاتا ہے جو مضرت کے ساتھ حاصل ہو۔'' (معارف القرآن جلد۱، سورۃ بقرہ، صفحہ۵۳۷، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ)

لہٰذا مندرجہ بالا فقہی ضابطہ کے تحت مسلمانوں میں عموماً اور مدارس میں خصوصاً تقویٰ کے معیار کو برقرار رکھنے کے لیے بھی کسی مشتبہ ٹیکنالوجی کی ترویج واشاعت سے اجتناب کے لیے کہا جائے گا؛ کیونکہ دفعِ مضرت مقدم ہے۔ لہٰذا جو حضرات صاحبانِ علم مدارس میں اختلافِ آراء کی آڑ میں مشتبہ ٹیکنالوجیز کی ترویج واشاعت میں اہم کردار ادا کررہے ہیں اُن کو اپنے طرزِعمل پر غور کرنا چاہیے۔

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوشش نمبر۱۲:

مدارس کے اندر عصری تعلیمی اداروں کے نظام کو اپنانا

کچھ مدارس میں مناقشات (تھیسس ڈیفنس) کے حوالے سے جو نئی ترتیب شروع ہوئی ہے اس میں محتاط رویہ اپنانے کی ضرورت ہے؛ کیونکہ یہ اگر مکمل طور پر عصری تعلیمی اداروں کی نہج پر کیا جائے گا تو ہم سب کو علم ہے کہ عالمی سائنسی دنیا میں ہمارے اسلامی ممالک کے عصری تعلیمی ادارے کیا حیثیت رکھتے ہیں؛ لہٰذا مدارسِ دینیہ مناقشات کے عنوان سے عصری تعلیمی اداروں کے کُلیۃ شرعیہ یا کُلیۃ اصول دین کے معیارات کو اپنانے کے بجائے اپنے نہج پر قائم رہیں۔

بقول شاعر ؎

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

تخصص کے طلبا، کے لیے مناقشات ایک اچھی مشق ہوسکتی ہے؛ کیونکہ اس سے ان طلبا، کی صلاحتیوں میں مزید نکھار پیدا ہوگا۔ مثلاً جب تخصص کے طلبا، اپنا فقہی تحقیقی کام پورا کرلیں تو ملک کے نامور اور مستند مدارس کے جید مفتیانِ کرام ایک کمیٹی کی صورت میں اس طالب علم سے اس کے فقہی تحقیقی کام سے متعلق ایک ڈیفنس کی صورت میں سوال و جواب کرلیں؛ مگر اس میں مستند مدارس کے جید مفتیانِ کرام پر ہی انحصار کیا جائے جن کے متعلق علم ہو کہ وہ مُتَصلِّب ہیں اور ہرگز عصری تعلیمی اداروں کے پروفیسروں اور جدیدیت سے متاثر مفتیانِ کرام کو شامل نہ کیا جائے۔

اب ہم مناقشات کے بارے میں مزید گہرائی میں جاتے ہیں۔ مغربی ترقی یافتہ ممالک میں عصری تعلیمی اداروں و یونیورسٹیوں میں جو سب سے اعلیٰ ڈگری ہے وہ پی ایچ ڈی کی ڈگری ہے جس میں سائنسی تحقیق سکھائی جاتی ہے۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری کا دورانیہ تین سے پانچ سال کا ہوتا ہے جس میں طالب علم سائنسی تحقیقی سوالات کے جوابات ڈھونڈتا ہے اور اپنے شعبے سے متعلق نئے علم کی تخلیق و تشریح کرتا ہے۔ جب پی ایچ ڈی سپروائزر یہ سمجھتا ہے کہ طالب علم کا سائنسی تحقیقی کام کسی قابل ہوگیا ہے تو باقاعدہ ایک تھیسس ڈیفنس کے انعقاد کے ذریعے اس طالب علم کو موقع فراہم کیا جاتا ہے کہ وہ پی ایچ ڈی پر کھنے والی کمیٹی کے سامنے اپنا سائنسی تحقیقی کام پیش کرے، اس کو ڈیفینڈ کرے اور پھر کامیابی کی صورت میں یہ کمیٹی اس کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کردیتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں سائنسی تحقیقی کام کی بنیاد پر ہی پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی جاتی ہے اور جتنی اچھے معیار کی یونیورسٹی ہوگی اور جس اعلیٰ معیار کے سائنسدان کی نگرانی میں طالب علم پی ایچ ڈی ڈگری کررہا ہے، اُسی لحاظ سے مناقشات میں طالب علم کو مشکلات بھی پیش آتی ہیں۔ عمومی طور پر اَقرِ باپَر وَری یا غیر معیاری سائنسی تحقیقی کام پر یا تعلقات کی بنا پر پی ایچ ڈی کی ڈگری یونیورسٹیاں تفویض نہیں کرتیں؛ کیونکہ اس سے ان یونیورسٹیوں کی ساکھ پر منفی اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا جو مغربی ترقی یافتہ ممالک سائنس وٹیکنالوجی میں مسلمان ممالک سے بہت آگے ہیں، اس کی بنیادی وجہ میرٹ کو مقدم اور معیار کا قائم رکھنا ہے۔

ہمارے یہاں عصری تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں بھی پی ایچ ڈی کروائی جاتی ہے؛ مگر ماضی کے ناخُوش گوار تجربات کی وجہ سے ہائر ایجوکیشن کمیشن نے پی ایچ ڈی ڈگری کے قوائد وضوابط

سخت کردیئے ہیں؛ تاکہ ان یونیورسٹیوں سے بھی اعلیٰ معیار کے پی ایچ ڈی فارغ ہوں؛ مگر افسوس کے ساتھ یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ باوجود اتنی سختی کے کچھ یونیورسٹیوں میں ابھی بھی تعلقات اور غیر معیاری پی ایچ ڈی ڈگریوں کا رواج ہے۔ یعنی ایچ ای سی نے اگر شرط رکھی ہے کہ ایک یا دو تحقیقی مقالہ لکھا جائے؛ تاکہ معیار قائم رہے تو بعض لوگ غیر معیاری تحقیقی جرائد میں اپنے مقالے چھاپ کر اس شرط کو پورا کر لیتے ہیں۔ اگر یہ شرط رکھی ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں سے کسی پروفیسر کو ممتحن کے طور پر متعین کیا جائے تو بعض حضرات اس میں بھی تعلقات استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں؛ تاکہ طالب علم کو پی ایچ ڈی کی ڈگری آسانی سے مل جائے۔ اب اگر مدارسِ دینیہ بھی انھیں یونیورسٹیوں کے نقشِ قدم پر چلیں گے تو پھر تخصص کے مناقشات بھی انھیں عصری تعلیمی اداروں کے معیار کے مطابق ہونے لگیں گے۔ شروع میں تو ہوسکتا ہے کہ کچھ معیار قائم رہے؛ مگر عصری تعلیمی اداروں کا تجربہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ایسی کوئی تدبیر مکمل طور پر کارگر نہ ہوگی اور پھر مدارسِ دینیہ کے تخصص کے طلباء بھی اُسی ڈگری حاصل کرنے کی ریس میں لگ جائیں گے جو کہ عصری تعلیمی اداروں کے کُلیۃ شرعیہ یا کُلیۃ اصول دین کے لوگ اپناتے ہیں۔ لہٰذا ہماری رائے میں مدارسِ دینیہ کو عصری تعلیمی اداروں کے کُلیۃ شرعیہ یا کُلیۃ اصول دین کی طرح ہرگز ہرگز نہ ہونا چاہیے ورنہ مدارس کا نظام ختم ہوجائے گا۔

نیز اس بات کی ذرہ برابر بھی کوشش اور فکر نہ کریں کہ دارالافتاء سے فارغ ہونے والے متخصصین حضرات اپنے فقہی تحقیقی مقالے سائنسی جرائد میں شائع کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان عصری تعلیمی اداروں کے بیشتر پروفیسر حضرات کی اپنی کوئی عالمی سائنسی حیثیت نہیں ہے اور وہ وہی غیر معیاری سائنسی تحقیق کا معیار مدارس میں بھی رواج دیں گے۔ لہٰذا پیسوں کے عوض کھلی رسائی والے جرائد، اور غیر معیاری سائنسی جرائد میں تحقیقی مقالے چھاپنے سے حتیٰ الامکان گریز کیا جائے اور مدارسِ دینیہ حتّی الوسع عصری تعلیمی اداروں کے فرسودہ اور غیر معیاری نظام کو اپنانے سے اپنے آپ کو بچائیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ مدارسِ دینیہ ان عصری تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں سے متاثر ہوکر اسلاف کے طرزِ عمل سے صرفِ نظر نہ کریں؛ بلکہ اسلاف کے طریقۂ کار پر مضبوطی سے جمے رہیں۔

دیکھیے اگر مدارسِ دینیہ کے مشیر سابق حکومتی بیوروکریٹ ہوں گے یا عصری جامعات کے پروفیسر ہوں گے تو پھر مدارس فکری ونظریاتی طور پر کہاں جائیں گے؟ یعنی یہ لوگ مدارسِ دینیہ میں وہ حکومتی وضعداری، انفرااسٹرکچر، اسٹینڈرڈ آپریٹنگ پراسیجرز تو لے کر آئیں گے؛ مگر فکری ونظریاتی طور پر مدارسِ دینیہ پھر اپنی اصل میراث سے دور چلے جائیں گے۔ لہٰذا گزارش یہی ہوگی کہ عصری

تعلیمی اداروں کے نظام کو مدارسِ دینیہ ہرگز نہ اپنائیں۔عصری تعلیمی اداروں کی فیکیلٹیز، فنڈنگ، طریقۂ تدریس، تحقیقی کام اور ظاہری اسباب سے ہرگز متاثر نہ ہوں؛ بلکہ جو اسلاف کا طریقۂ کار ہے اسی پر کاربند رہتے رہیں، اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے چلیں، اسی میں نجات ہے اور اسی میں مدارسِ دینیہ کی بقا ہے۔راقم نے چونکہ انھیں عصری تعلیمی اداروں میں زندگی کھپادی ہے، انھیں سے پڑھا ہے، انھیں میں پڑھایا ہے، ملکی وعالمی سطح پر بھی ان عصری تعلیمی اداروں میں اپنی خدمات انجام دیتا رہا ہے اور جامعات کا ویژن تک بنایا ہے؛ لہٰذا بڑے دردِ دل کے ساتھ یہ گزارشات کررہا ہے کہ ان عصری تعلیمی اداروں سے مدارسِ دینیہ ذرہ برابر بھی متاثر نہ ہوں۔

عصری تعلیمی اداروں میں تحقیق کے عنوان سے اگر مدارسِ دینیہ متاثر ہورہے ہیں تو ایک مثال سے بات واضح کرتا ہوں۔عصری تعلیمی اداروں میں کچھ پروفیسر حضرات مافیا کے طریقے پر کام کرتے ہیں اور ان کی اپنی ایک دنیا ہے۔ان کو عالمی سائنسی تحقیقی دنیا سے کوئی سروکار نہیں۔ایک مشہور جامعہ میں ایک جاننے والے پروفیسر ہیں۔تنخواہ اچھی خاصی ہے، گاڑی، گھر اور میڈیکل، یہ سب سہولیات ہیں۔ ہفتے میں ایک کورس جس کی تدریس صرف دو گھنٹے ہوتی ہے، وہ یہ کرتے ہیں، ان کی اپنی لیب ہے جس میں بیسیوں ماسٹرز کے اسٹوڈنس موجود ہیں اور کئی پی ایچ ڈی اسٹوڈنس ہیں، غرض یہ ان کی اپنی سلطنت ہے۔اُن سے گاہے بگاہے بات چیت رہتی ہے اور اُن سے عرض کیا جاتا ہے کہ آپ معیاری سائنسی تحقیق کریں، ایسی سائنسی تحقیق ہو جس کا معاشرے پر اثر ہو، آپ کے سائنسی مقالے دنیا کے بہترین سائنسی جرائد میں چھپیں، آپ کے یہاں سے ماسٹرز اور پی ایچ ڈی کرنے والے طلباء کی استعداد اور معیار عالمی سطح کی ہو تو اُن کا جواب ان کے طرزِ عمل سے واضح ہے کہ دیکھیے، ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اپنی جان کھپائیں؟ کیا ضرورت ہے کہ عالمی معیار کی سائنسی تحقیق کی جائے؟ جب کام چل رہا ہے، ماسٹرز کے طلباء غیر معیاری کام کرکے ہی یونیورسٹی سے فارغ ہورہے ہیں، ڈگریاں مل رہی ہیں اور پذیرائی بھی مل رہی ہے، تو کون اس معیاری سائنسی تحقیق کا سردرد لے؟ افسوس کہ یہ وہ سوچ ہے جو عصری تعلیمی اداروں و یونیورسٹیوں میں رائج ہے، اسی وجہ سے ہم سائنس و ٹیکنالوجی میں عالمی قوتوں کا مقابلہ نہیں کرپارہے۔ابھی جب یہی پروفیسر حضرات کے پاس ہمارے مدارس کے تخصص کے فارغ ہونے والے جارہے ہیں، تو یہ پروفیسر حضرات ان کو یہی سائنسی تحقیق بھی سکھارہے ہیں اور مدارسِ دینیہ کے اندر بھی یہ غلط تحقیقی طریقۂ کار رواج پارہا ہے۔نوجوان مفتیانِ کرام مفتی کے ساتھ ساتھ پی ایچ ڈی ڈاکٹر تو بن رہے ہیں؛ مگر ان میں سائنسی تحقیقی صلاحیت کا

فقدان ہے اور مشاہدے میں یہ بات آ رہی ہے کہ اب یہ نوجوان مفتیانِ کرام بھی انھیں عصری تعلیمی اداروں کی نہج پر چل کر غیر معیاری عالمی سائنسی جرائد میں اپنے تحقیقی مقالے چھاپ رہے ہیں۔ یہ انتہائی فکرمندی کی بات ہے کہ مدارسِ دینیہ جو کہ اپنے معیاری فقہی مقالوں کے وجہ سے معروف ہیں اُن میں اب یہ غیر معیاری سائنسی تحقیق کا زہر داخل ہو رہا ہے۔

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوشش نمبر ۱۳:

جدید محاذ پر کام کرنے والے علماء کا علماء راسخین کے طرز کو چھوڑنا

ایک ذہن سازی نوجوان مفتیانِ کرام کی یہ کی جارہی ہے کہ وہ سمجھیں کہ علمائے کرام کے دو طبقات ہیں، ایک علماء راسخین اور دوسرے جدید محاذ پر کام کرنے والے علمائے کرام اور یہ جو جدید محاذ پر کام کرنے والے علمائے کرام ہیں بس یہی سب کچھ ہیں اور ساری قابلیت، استعداد، خیالات کی پختگی، دینی و دنیاوی علوم میں رُسوخ صرف انھیں کو حاصل ہے اور انھیں جدید محاذ پر کام کرنے والے علماء کرام کے اندر صلاحیت ہے کہ وہ عالمی سطح پر دیگر اقوام سے مکالمہ بھی کرسکیں اور اُمت کی جدید مسائل میں راہ نمائی بھی کرسکیں۔ نیز یہ بات بھی ذہنوں میں بٹھائی گئی ہے کہ دیگر اسلامی ممالک میں انھیں جدید محاذ پر کام کرنے والے علماء کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لہٰذا اس بات کی زور وشور کے ساتھ ترغیب دی جاتی ہے کہ نئے نوجوان علمائے کرام اپنے آپ کو علماء راسخین سے دور رکھیں، اور علماء راسخین کے نہج پر نہ چلیں بلکہ مختلف شریعہ سرٹیفیکیشن کریں، شریعہ ایڈوائزری بورڈز کے ممبر بنیں، اپنی کمپنیاں قائم کریں، اپنے اسٹارٹ اپس قائم کریں، میڈیا پر آئیں، کانفرنسوں کا انعقاد کروائیں، اور عصری تعلیمی اداروں کے ساتھ گھل مل جائیں۔ لازمی بات ہے کہ جب اس طرح کا اتحاد اور تعامل کیا جائے گا تو تھوڑی بہت لچک کا مظاہرہ تو کرنا ہی ہوگا یعنی پھر خواتین کے ساتھ تعامل اور اختلاط بھی ہوگا، تصویریں بھی بنیں گی، منکرات میں تھوڑا بہت شامل ہونا پڑے گا۔ دیکھیے یہ ساری چیزیں دنیادار طبقے میں ہوتی تھیں؛ مگر جس سُرعت کے ساتھ نوجوان مفتیانِ کرام ان منکرات کو اختیار کررہے ہیں یہ بہت تشویش کی بات ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ذہن سازی بھی کی جارہی ہے کہ جدید محاذ پر کام کرنا علماء راسخین کا کام نہیں ہے، یہ فرسودہ اور دقیانوسی مدارس کے لوگ ہیں اور یہ معاشرے کے لیے مفید بھی نہیں، نعوذ باللہ۔ یہ تمام باتیں راقم کی ذہنی اختراع نہیں؛ بلکہ مشاہدات پر مبنی ہے کہ کچھ مدارس کے نوجوان علمائے کرام کی ایک مُعتَدبہ تعداد اس ذہنیت کی حامل ہوگئی ہے۔ اللہ پاک مدارس کی حفاظت فرمائے، آمین۔

مدارسِ دینیہ کوختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوشش نمبر۱۴: اکابر کی رائے کو منظّم طریقے سے روکنا

مدارسِ دینیہ کوختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوششوں میں سے ایک کوشش یہ ہے کہ اکابر کی کسی مسئلہ میں دی گئی رائے کو منظّم طریقے سے روکا جائے۔ راقم کوایک بہت ہی عجیب مشاہدہ ہوااور وہ یہ کہ ایک مسئلہ سے متعلق اکابر میں سے ایک انتہائی معتبر شخصیت نے اپنی ایک رائے دی ہوئی ہے اور کئی پلیٹ فارمز پر دی ہوئی ہے جس میں تحریراً اور تقریراً دونوں ہی مواد شامل ہے۔ راقم کو براہ راست بھی ان بزرگ شخصیت سے بات کرنے کی توفیق ملی تو ان بزرگ شخصیت نے اپنی اُسی رائے کو راقم کے سامنے بھی دہرایا۔ اب ان بزرگ شخصیت کی رائے کو بڑے ہی منظّم طریقے سے دھندلانے کی کوشش کی جارہی ہے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی جارہی ہے کہ اُنہوں نے یہ بات کی ہی نہیں اور نہ ہی اُن کی کسی جدید مسئلہ میں ایسی کوئی رائے ہے۔ عجیب بات اس میں یہ ہے کہ ایسا کرنے والوں میں اُن بزرگ کے گرد جو کچھ حلقۂ احباب ہیں اور کچھ صاحبانِ علم ہیں، وہی یہ سب کچھ کررہے ہیں اور جان بوجھ کر منظّم طریقے سے کررہے ہیں۔ اس سے راقم کے اس تشویش کو مزید تقویت ملتی ہے کہ اکابر کی اپنی ایک رائے ہوتی ہے اور اس پر وہ جمے ہوتے ہیں؛ مگر کچھ خاص لوگ، جن کا ایک خاص ایجنڈہ ہوتا ہے، وہ اکابر کے آس پاس رہتے ہوئے نہ صرف یہ کہ اکابر کی اس رائے کی نفی کرتے رہتے ہیں؛ بلکہ ایسے تمام مواد اور لوگوں کو ان اکابر سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جن سے ان کا نظریہ نہیں ملتا اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے یہ لوگ اپنی پوری کوشش کرکے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ کوئی دوسری رائے اور حقائق اکابر تک نہ پہنچ پائیں اور نہ ہی اکابر کی بات عوام تک پہنچ پائے اور اگر پہنچ بھی جائے تو یہ لوگ منظّم طریقے سے اس کی نفی کردیتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ حضرات چونکہ اکابر کے ''قریب'' ہیں لہٰذا ان کی بات کو تسلیم کیا جائے کہ اکابر نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ اللہ پاک جزائے خیر عطا فرمائے ہمارے اکابر کو کہ ان کو ایسے لوگوں سے متعلق فراست ہے اور اکابر کو ان تمام باتوں کا ادراک بھی ہے۔

ہماری گزارش اس تناظر میں یہ ہوگی کہ مدارسِ دینیہ کے اکابر حضرات اپنے اردگرد کے لوگوں پر خاص نظر رکھیں؛ کیونکہ ایسے ہی حضرات اُمت میں افتراق کا ذریعہ بنتے ہیں اور انھیں حضرات کی وجہ سے دیگر اکابرین میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور ایسے ہی حضرات کی وجہ سے یہ تاثر جاتا ہے کہ اکابر کا کسی مسئلہ میں اختلاف ہے؛ جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ اسی سے اس تاثر کو بھی مزید تقویت ملتی ہے کہ گزشتہ کئی سالوں کی محنت سے اکابر حضرات کو ٹارگٹ کیا گیا ہے اور بجائے اس کے کہ اکابر

کی براہ راست نفی کی جائے، اکابر کے اردگرد جتنے بھی معتمد خاص لوگ ہیں، ان پر محنت کی جائے، ان کے ذہنوں کو تبدیل کیا جائے اور ''اپنے لوگ'' مدارسِ دینیہ میں امپلانٹ یعنی مدارس کے سسٹم میں داخل کیے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اکابر کو بذاتِ خود اپنے ادارے کی جانب سے اپنا موقف عوام تک پہنچانے میں مشقت ہوتی ہے۔ اس بات کو شطرنج کے کھیل کی مثال سے سمجھتے ہیں۔ شطرنج کے کھیل میں جب کسی مخالف بادشاہ کو مات کرنا ہدف ہوتا ہے تو اس مخالف بادشاہ کو براہ راست مارا نہیں جاتا؛ بلکہ مخالف بادشاہ کے اردگرد جتنے بھی مُہرے ہوتے ہیں ان کو شکست دی جاتی ہے اور بالآخر بادشاہ کو بھی شکست ہوجاتی ہے۔ اب مدارسِ دینیہ کے تناظر میں جو کچھ بڑے اکابر ہیں، ان کے اردگرد کچھ صاحبانِ علم کے ذہنوں کو ہی کئی سالوں کی محنت سے تبدیل کرلیا گیا ہے، جس کی وجہ سے کچھ دینی مدارس کو بحیثیتِ ادارہ کسی مسئلہ میں اپنی رائے دینے میں دشواری ہوتی رہی ہے؛ کیوں کہ اندر ہی سے رکاوٹ ہے۔

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوشش نمبر ۱۵: تقریبِ ختمِ بخاری ہوٹلوں میں منعقد کرنا

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوششوں میں سے ایک کوشش یہ ہے کہ اسلاف کے طریقۂ کار سے ہٹا جائے اور اسی سلسلے میں کچھ صاحبانِ علم جو کہ دیارِ مغرب سے تعلیم حاصل کرکے آئے ہیں، مدارس سے دینی تعلیم بھی حاصل کی ہے اور پھر مدارس سے منسلک ہوگئے ہیں، اکابر کے نام لیوا بھی ہیں؛ مگر دانستہ یا نادانستہ طور پر اکابر کے طرزِ عمل سے دوری اختیار کررہے ہیں اور تقریبِ ختمِ بخاری اب عالیشان ہوٹلوں میں منعقد ہونا شروع ہوگئی ہیں۔ اس میں کافی سارے مفاسد اکھٹے ہورہے ہیں مثلاً تصویر کشی، فلم سازی، دینی تعلیم کی روح سے ہٹ کر ظاہری شان وشوکت کو ظاہر کرنا، طعام میں دسترخوان کی ترتیب سے ہٹ کر ٹیبل کرسی کو اختیار کرنا اور مسجد کے نورانی ماحول سے نکل کر ہوٹلوں میں ایسی تقاریب کو منعقد کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ وہ حضرات یہ سارا عمل مدارسِ دینیہ میں جِدّت لانے کے عنوان سے کررہے ہیں اور ان حضرات کا مَطمَعِ نَظر بادیٔ النّظر میں یہ لگتا ہے کہ اُن کے ذہنوں میں یہ بات ہے کہ غیروں کی اچھی چیزوں کو اپنانے میں کوئی حرج نہیں۔ ہمارے اکابر کی کبھی بھی یہ سوچ اور عمل نہیں تھا کہ ظاہری شان وشوکت پر توجہ دیتے؛ بلکہ وہ تو اخلاص کے پیکر تھے۔ وہ روکھی سوکھی کھالیتے تھے، اسباب کے حساب سے وسائل کی تنگی تھی؛ مگر غیروں کی اچھی چیزوں کو بھی بِالکُلِّیہ اختیار نہیں کرتے تھے؛ کیونکہ اس میں تشبہ بالکفار ہوتا؛ بلکہ ہمیشہ اسلاف کے طریقۂ کار کو اختیار کرتے تھے۔ ہم قارئین سے درخواست کریں گے کہ وہ ضرور حضرت مولانا قاری محمد طیب

قدس اللہ سرہ کی کتاب ''التشبہ فی الاسلام'' کا مطالعہ فرمالیں جس میں ان تمام مضامین کا احاطہ کیا گیا ہے اور مختلف اشکالات کے جواب شافی دیے گئے ہیں۔

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوشش نمبر ۱۶: ٹی وی پروگرامز اور مخلوط محفلوں میں جانا

ایک تاثر جو مدارسِ دینیہ کے نوجوان طلبائے کرام کے ذہنوں میں ڈالا جارہا ہے وہ یہ کہ وہ یہ سوچیں کہ مدارس کی تعلیم سے فراغت کے بعد ان کے کیریئر کا کیا ہوگا اور ہماری رائے میں یہ بھی مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی ایک خفیہ کوشش ہے۔ یعنی کچھ صاحبانِ علم ان نوجوان طلبائے کرام کو باقاعدہ ترغیب دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ جب آپ مدرسہ کی تعلیم سے فارغ ہوجائیں تو آپ ہمارے جیسے بنیں اور وسعتِ نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے متحرک ہوں، اور ٹی وی پروگرامز اور مخلوط محفلوں میں شرکت کریں۔ آپ نوجوان علمائے کرام جب معاشرے میں مکمل طور پر Integrate گھل مل جائیں گے تو اس سے مدارسِ دینیہ کو تقویت ملے گی اور مدارس کا موقف میڈیا کے توسط عوام الناس تک آسانی سے پہنچے گا۔ اب جب نوجوان علمائے کرام اپنے سے بڑوں کو اس طرح کے ٹی وی پروگرامز اور مخلوط محفلوں میں جاتا دیکھتے ہیں تو وہ خود بھی اس عمل کو قابلِ رشک نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور اسی طرز پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابتداء میں تو محض چند افراد ہی مدارسِ دینیہ کے موقف کو میڈیا کے ذریعے عوام تک پہنچانے کے ذمہ دار تھے؛ مگر آہستہ آہستہ ایک کثیر تعداد نوجوان مفتیانِ کرام کی اب میڈیا کے ساتھ منسلک ہوگئی ہے اور اُن کا اوڑھنا بچھونا میڈیا بن گیا ہے۔ مدارسِ دینیہ کو اس بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت ہے کہ مدارسِ دینیہ سے فارغ ہونے والے حضرات ظاہری و باطنی ہر طرح کے گناہوں سے اجتناب فرمائیں۔

مدارسِ دینیہ کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوشش نمبر ۱۷: ''مولانا'' اور ''مفتی'' کے القابات سے احتراز کرنا

مدارسِ دینیہ کو ختم کرنے اور کمزور کرنے کی خفیہ کوششوں میں سے ایک کوشش یہ ہے کہ مدارسِ دینیہ کے طلباء کے ذہنوں میں عصری تعلیمی اداروں کی ڈگریوں کی اہمیت بٹھا دی جائے اور نتیجتاً وہ معزز مذہبی القابات کو استعمال کرنے سے گریز کریں۔ یہ کوشش تو سامراجی دور سے کی جاتی رہی ہے کہ لفظ ''مولانا''، ''ملا'' اور ''مولوی'' کی تحقیر کی جائے اور عوام کو علمائے کرام سے متنفر کیا جاسکے۔

حضرت مفتی رفیق احمد بالاکوٹی دامت برکاتہم ایک سائل کے جواب میں یہ تحریر فرماتے ہیں:

''''مولانا''، ''ملّا'' اور ''مولوی'' یہ الفاظ بالعموم اسلامی پیشواؤں کے لیے احترام و تعظیم کی

غرض سے بولے جاتے تھے اور اب بھی شرفاء کے یہاں تعظیم کے لیے ہی مستعمل ہیں۔ کسی عالم دین کے لیے ہمارے ہاں احتراماً ''مولانا'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے، افغانستان اور آزاد ریاستوں نیز ترکی تک ''دینی عالم'' کو ازراہِ احترام یا علمی فراوانی کی وجہ سے ''ملا'' یا ''ملا'' کہا جاتا تھا، ہمارے ہاں لفظ ''علامہ'' اسی کے مترادف استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح خداترس ماہر علم کے لیے فارسی بولنے والے خطوں میں ''مولوی'' کا لفظ استعمال کیا جاتا رہا ہے اور وہیں سے ہمارے ہاں بھی وارد ہوکر عام استعمال میں آچکا ہے، جیسے ''مولوی معنوی''، ''مولوی عبدالحق'' وغیرہ۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں

''مولوی اسی کو کہتے ہیں جو مولیٰ والا ہو، یعنی علم دین بھی رکھتا ہو اور متقی بھی ہو، خوفِ خدا وغیرہ اخلاقِ حمیدہ رکھتا ہو۔'' (التبلیغ، ص:۱۳۳، جلد اول بحوالہ تحفۃ العلماء از مولانا محمد زید، جلد اول، ص:۵۲، البرکۃ کراچی)

نیز لکھتے ہیں: ''مولوی میں نسبت ہے مولی کی طرف، یعنی مولیٰ والا۔'' (ایضاً)

الغرض یہ الفاظ اصطلاحی اعتبار سے ازراہِ احترام دین کے ماہر ومستند علماء کے لیے ایجاد و استعمال ہوتے تھے۔ فی زمانہ مسلمان گھرانوں میں پیدا ہونے والا دین بیزار طبقہ، جو دین کو براہِ راست مطعون کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا، وہ علمائے دین سے تقدس واحترام کی چادر کھینچ کر اپنی مذہب بیزاری کی تسکین چاہتا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں؛ بلکہ ایسے علماء جو اپنے کردار وعمل کی بنا پر باطل کی آنکھوں کا کانٹا بنتے چلے آرہے ہوں، ہمیشہ سے باطل پرستوں کے نشانہ پر رہے ہیں اور ان کے خلاف مختلف قسم کے پروپیگنڈے، الزامات اور بے توقیری کے القابات عام کیے جاتے ہیں؛ تاکہ عوام متنفر ہوکر ان سے دور ہوجائیں، اور علماء سے دوری، دین سے دوری کا باعث ہوتی ہے، اس طرح دین بیزار طبقہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیابی ڈھونڈتا چلا آرہا ہے۔'' (مفتی رفیق احمد بالاکوٹی مدظلہ، مولانا، ملا اور مولوی کی اصطلاحات، جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ، مارچ ۲۱۰۶ء)

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ یہ القابات معزز ہیں اور اسلامی پیشواؤں کے لیے احترام وتعظیم کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں اور ان القابات کا استعمال صحیح جگہوں پر کرتے ہوئے اِحتراز نہیں کرنا چاہیے؛ البتہ ان القابات کے استعمال میں اِفراط وتفریط سے بھی گریز کرنا چاہیے، جیسا کہ تحریر ہے۔

''آج کل ہمارے معاشرے میں مذہبی القاب کے استعمال کرنے میں جو بے اعتدالیاں پائی جارہی ہیں، وہ کسی سے اوجھل نہیں۔ نام کے آگے القاب پر القاب جڑ دیے جاتے ہیں، خواہ وہ شخص

ان صفات کا حامل ہو یا نہ ہو۔ آئے دن نئے سے نئے اور بڑے سے بڑے القاب سامنے آتے ہیں۔ بعض اوقات تو جلسوں میں اور بعض دیگر مجالس میں امیروں، وزیروں، عہدیداروں، پیروں اور خصوصاً علماء کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے جاتے ہیں، مثلاً کسی کے لیے حجۃ الاسلام، کسی کے لیے شیخ الاسلام، کسی کے لیے شیخ الفقہ، کسی کے لیے شیخ الحدیث، کسی کے لیے مفتی اعظم، کسی کے لیے خطیب بے بدل، خطیبِ زماں، نمونۂ اسلاف، محققِ دوراں، محقق العصر، علامۃ العصر، محدث العصر، فقیہِ زماں، جامعِ علوم عقلیہ ونقلیہ، شیخ المشائخ، اعلیٰ حضرت، مفکرِ اسلام، غزالیِ وقت، غزالیِ دوران، شہنشاہِ خطابت، محقق علی الاطلاق، محدثِ اعظم، شیخ الجامعہ، ولیِ کامل، رہبرِ شریعت، ثانیِ جنیدؒ، وغیرہ وغیرہ۔'' (مولانا سید محمد انور شاہ، مذہبی القابات اور ہماری بے اعتدالیاں، ذوالحجہ ۱۴۴۰ھ، اگست ۲۰۱۹ء)

ہمارے مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ بعض نوجوان مفتیانِ کرام بڑے فخر سے ''ڈاکٹر'' کا لقب اور مختلف عالمی شریعہ سرٹیفکیشن تو بہت فخریہ انداز میں اپنے نام سے پہلے استعمال کرتے ہیں البتہ وہ ''مولانا''، اور ''مفتی'' کے القاب سے احتراز کرتے ہیں اور وہ یہ دنیاوی طبقہ کے اندر زیادہ کرتے ہیں اور غالباً وہاں ایسا کرنے سے ان میں سے کچھ حضرات کا مقصد یہ ہوتا ہوگا کہ وہ دنیا دار طبقے کو باور کرواسکیں کہ دین دار طبقہ بھی یہ دنیاوی ڈگریاں لے سکتا ہے اور دنیاوی علوم میں کسی سے پیچھے نہیں۔ ہماری تشویش یہ ہے کہ ان نوجوان مفتیانِ کرام پر دنیاوی ڈگریوں اور ''ڈاکٹر'' جیسے القاب کا ایک سحر طاری کر دیا گیا ہے اور یہ نوجوان مفتیانِ کرام نے اب اپنے آپ کو دنیا دار ڈگری والوں کی طرح ڈھالنا شروع کر دیا ہے۔ ایسے نوجوان مفتیانِ کرام کہ خدمت میں مؤدبانہ گزارش ہے کہ آپ نوجوان مفتیانِ کرام تو دین کی اصل نمائندگی کرنے والے ہیں، آپ دین کو مستحکم کرنے والے ہیں، دین کے سپاہی ہیں، آپ حضرات کو ہی اسلام کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کرنی ہے لہٰذا مؤدبانہ گزارش ہے کہ آپ کو اپنی دینی نسبت پر فخر ہونا چاہیے چہ جائے کہ ''مولانا'' اور ''مفتی'' کے القاب لگانے سے احتراز کیا کریں۔

خلاصۂ مضمون اور مدارس کو کمزور کرنے کی خفیہ کوششوں کے تدارک کے سلسلے میں چند گزارشات

خلاصۂ مضمون یہ ہے کہ مدارسِ دینیہ ہی وہ جگہیں ہیں جہاں پر دین اپنی اصل شکل میں موجود ہے اور اگلی نسل میں منتقل ہونے کا ذریعہ ہے۔ اگر ان مدارس کو اُن کی اصل شکل میں قائم رکھا گیا، جو کہ رہیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ، اور مدارس کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوششوں کا بروقت تدارک کیا گیا، تو

ہم امید رکھتے ہیں کہ دین اپنی اصل شکل میں آئندہ نسلوں تک منتقل ہوتا رہے گا۔اس سلسلے میں بندہ نے مدارس کو ختم اور کمزور کرنے کی خفیہ کوششوں کے تدارک کے سلسلے میں چند گزارشات پیش کی ہیں ان کا خلاصہ درجِ ذیل ہے۔

- ✓ تحقیق کے عنوان سے مدارس میں غیر معیاری و غیر سائنسی تحقیق کو پنپنے نہ دیا جائے اور ایسے لوگوں اور اداروں کی حوصلہ شکنی کی جائے جو غیر معیاری و غیر سائنسی تحقیق ان مدارس میں رائج کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔
- ✓ اگر کوئی سائنسی تحقیقی موضوع ہے جس پر تحقیق جاری ہے تو ایسے تمام مباحث کو علمی حلقوں تک محدود رکھا جائے اور عوامی سطح پر حتمی رائے پیش کرنے سے گریز کیا جائے تا آں کہ اس سائنسی مسئلے سے متعلق جمہور مفتیانِ کرام کی رائے نہ آجائے۔
- ✓ اگر جمہور مفتیانِ کرام کی رائے کسی مسئلے سے متعلق عدم جواز کی ہو تو تحقیق کی آڑ میں اس کے جواز کے دلائل کو عوامی سطح پر موضوعِ بحث نہ بنایا جائے اور نہ ہی اس کی بڑے پیمانے پر تشہیر کی جائے کیونکہ اس سے عوام کا مشتبہ چیزوں میں پڑنے کا اندیشہ ہوگا۔
- ✓ مدارس میں تحقیق کے حوالے سے ہرگز جمود نہ طاری کیا جائے؛ بلکہ جس طریقے سے مستند مدارس میں تحقیقی کام چل رہا ہے اس کو مزید پروان چڑھایا جائے؛ البتہ چونکہ مدارس ہی کے اندر کچھ ایسے ڈاکٹر حضرات بھی آچکے ہیں جن کے ذہن مغربیت سے متاثر ہیں اور جو جمہور علمائے کرام کی رائے سے ہٹ کر انفرادی رائے رکھتے ہیں جو کہ سائنسی طور پر بھی درست نہیں لہٰذا اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ صرف اُن کی معلومات پر اندھا اعتماد نہ کیا جائے؛ بلکہ سائنسی معلومات کئی عالمی سائنسی اور معاشی ماہرین سے لی جائیں؛ تاکہ مسئلہ کی سائنسی ماہیت سمجھنے میں کوئی پروپیگنڈہ شامل نہ ہو اور اصل سائنسی حوالہ جات کی جانچ پڑتال بھی کی جائے۔پھر جاکر کسی مسئلہ میں کوئی رائے قائم کی جائے۔
- ✓ کچھ مدارس میں مناقشات (تھیسس ڈیفنس) کے حوالے سے جو نئی ترتیب شروع ہوئی ہے اس میں محتاط رویہ اپنانے کی ضرورت ہے؛ کیونکہ یہ اگر عصری تعلیمی اداروں کے نہج پر کیا جائے گا تو ہم سب کو علم ہے کہ عالمی سائنسی دنیا میں ہمارے اسلامی ممالک کے عصری تعلیمی اداروں کی تحقیق کیا حیثیت رکھتی ہے۔لہٰذا مدارسِ دینیہ مناقشات کے عنوان سے عصری تعلیمی اداروں کے کُلیتہ شرعیہ یا کُلیتہ اصول دین کے معیارات کو اپنانے کے بجائے اپنے نہج پر قائم رہیں اور اس بات

کی ذرہ برابر بھی کوشش اور فکر نہ کریں کہ دارالافتاء سے فارغ ہونے والے متخصصین حضرات اپنے فقہی تحقیقی مقالے جرائد میں شائع کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان عصری تعلیمی اداروں کے بیشتر پروفیسر حضرات کی اپنی کوئی عالمی سائنسی حیثیت نہیں ہے اور وہ وہی غیر معیاری سائنسی تحقیق کا معیار مدارس میں بھی رواج دیں گے۔ لہٰذا پیسوں کے عوض کھلی رسائی والے جرائد، اور غیر معیاری سائنسی جرائد میں تحقیقی مقالے چھاپنے سے حتّی الامکان گریز کیا جائے۔

- ✓ مدارسِ دینیہ بذات خود کسی مسئلے میں فریق نہ بنیں یعنی مدارسِ دینیہ سے وابستہ افراد کا کسی مسئلہ میں مفاد وابسطہ نہ ہونا چاہیے وگرنہ مدارسِ دینیہ کسی سائنسی مسئلہ میں غیر جانبدارانہ شرعی حُکم نہ بتا سکیں گے۔
- ✓ جدید سائنسی مسائل بتاتے وقت اگر مدارسِ دینیہ نوجوان مفتیانِ کرام میں بنیادی سائنسی صلاحیت پیدا کردیں کہ کس طریقے سے تعین کیا جائے گا کہ کون سی سائنسی تحقیق معیاری ہے اور کون سے سائنسدان عالمی طور پر مستند مانے جاتے ہیں تو اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ کسی بھی سائنسی مسئلے میں اس چیز کی اصل اور حقیقی ماہیت نکھر کر سامنے آئے گی جس سے مفتیانِ کرام کو صحیح مسئلہ اُمت کو بتانے میں سہولت ہوگی ورنہ بتائے گئے مسئلہ کی سائنسی بنیاد کمزور اور درست نہ ہوگی۔
- ✓ مدارسِ دینیہ ٹیکنالوجی سے متعلق ایسے کورسیز کروانے اور اس کے ذریعے سے پیسے کمانے کے طریقے نوجوان مفتیانِ کرام کو سکھانے سے اجتناب کریں جس ٹیکنالوجی کے مشتبہ ہونے کا شبہ ہے۔
- ✓ حکومتی شریعہ ایڈوائزری بورڈز میں صرف انھیں لوگوں کو آگے جانے دیا جائے جو مُتَصلِّب ہوں اور جمہور اور اکابر حضرات کی رائے کو ہی فوقیت دی جائے۔ اگر تحقیق سے کسی شریعہ ایڈوائز کے متعلق یہ معلوم ہو کہ وہ جمہور کی رائے سے ہٹ کر رائے اختیار کر رہے ہیں اور اپنے ایجنڈے کی ترویج و اشاعت کے لیے اپنے شریعہ ایڈوائزری بورڈ کے عہدے و حکومتی وسائل کو استعمال کر رہے ہیں تو اُن کے خلاف بڑے اکابرین کے مشورے سے تادیبی کارروائی کے بارے میں سوچا جائے اور آئندہ کے لیے اُن کو شریعہ ایڈوائزری بورڈ کا ممبر نہ بننے دیا جائے۔
- ✓ مدارس کے اندر اکابرین کی مشاورت کا ایسا نظم بنایا جائے کہ کوئی نوجوان صاحبِ علم اپنے ''مفتی'' کے ٹائٹل کو استعمال کرتے ہوئے عوامی سطح پر جمہور علمائے کرام کی رائے سے نہ ہٹے؛ تاکہ عوام گمراہی سے بچے رہیں۔
- ✓ اسمارٹ فون سے متعلق اکابر علمائے کرام کی رائے کو پیشِ نظر رکھا جائے اور مدارس کے پاکیزہ

ماحول کو اس سے دور رکھا جائے۔

- ✓ مدارس کے نصاب کی تبدیلی سے حتیٰ الامکان گریز کیا جائے اور اُن مدارس کی حوصلہ شکنی کی جائے جو روایتی دینی کُتب کو فرسودہ کہتے ہیں۔ نیز نصاب میں تبدیلی ضرورت کے درجے میں ہونی چاہیے؛ مگر اس کے لیے وفاق المدارس کے متعلقہ فورم سے ہی رجوع کیا جائے اور اُنہی اکابرین کی سفارشات پر عمل کیا جائے جو کہ نصاب کمیٹی میں شامل ہیں۔
- ✓ انگریزی سکھانے کی آڑ میں ایسے علمائے کرام کہ جن کو انگریزی نہیں آتی، اُن کی ہرگز تحقیر نہ کی جائے؛ بلکہ نوجوان مفتیانِ کرام کی ذہن سازی کی جائے کہ وہ یہ سوچ رکھیں کہ اصل علم ان روایتی علمائے کرام اور مدارس کے مُدرِّسین کے ہی پاس ہے۔
- ✓ دینی علوم حاصل کرنے کے لیے روایتی دینی کُتب پر ہی انحصار کیا جائے چہ جائے کہ مستشرقین اور عصری دینی تعلیمی اداروں کی کُتب بنیادی مآخذ کے طور پر مدارس میں رائج کی جائیں۔
- ✓ معاشیات کے علوم کے لیے عالمی سائنسی ومعاشی ماہرین کی تحقیق کو پڑھنے کو رواج دیا جائے اور اُن کی سائنسی تحقیق پر ہی مسئلہ کی بنیاد رکھی جائے اور غیر معیاری سائنسی جرائد کو فوقیت نہ دی جائے؛ بلکہ ایسے تمام جرائد کی نشاندہی کر کے مدارس میں تخصص کے طلبائے کرام کو اُن جرائد میں چھاپنے کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے۔
- ✓ مسائل کا متبادل حل دیتے وقت شریعت کے احکامات کے دائرہ میں رہتے ہوئے متبادل حل ڈھونڈا جائے۔

یہ چند گزارشات ہیں جو راقم نے مدارس سے متعلقہ حضرات کی خدمت میں پیش کی ہیں۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اللہ پاک ہمارے مدارسِ دینیہ کی ہر طرح سے حفاظت فرمائے، اور علمائے کرام اور مفتیانِ کرام کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے! آمین یارب العالمین!

* * *

ذوق انفرادیت—ایک بیماری

از: محمد طیب حنیف

دین اسلام کی بنیاد توارث وتعامل ونقل روایات پر قائم ہے، اور امت کا سواد اعظم جس کو جمہور امت سے تعبیر کیا جاتا ہے کبھی کسی مسئلہ پر قطعی ضلالت پر مجتمع نہیں ہوتا ہے، ابن ماجہ کی روایت ہے:

''إِنَّ أُمَّتِیْ لَاتَجْتَمِعُ عَلٰی ضَلَالَةٍ، فَإِذَا رَأَیْتُمْ اِخْتِلَافًا فَعَلَیْکُمْ بِالسَّوَادِ الْأَعْظَم''(۱)

ترجمہ: ''بلاشبہ میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی، سو جب اختلافات دیکھو تو سواد اعظم کی پیروی تم پر لازم ہے۔''

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ جمہور کے مسلک کی پیروی درحقیقت فرمانِ رسول ﷺ کی بجا آوری ہے، اور اس سے انحراف سنتِ نبوی ﷺ کی مخالفت ہے۔

دورِ حاضر اور ذوق انفرادیت ایک ناسور مرض

آج ہم جس دور میں زندگی بسر کررہے ہیں اس میں ذوق انفرادیت کی جانب میلان نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے؛ چنانچہ ایک بڑی تعداد حوصلہ مند ذکی وفطین افراد کو یہ فکر دامن گیر نظر آتی ہے کہ لوگ ان کی پیروی کیوں نہیں کرتے؟ ان کو آئیڈیل تسلیم کیوں نہیں کیا جاتا؟ معیار حق میں ان کو شامل کیوں نہیں کیا جاتا؟ چنانچہ اس مقصد وہدف کے حصول کی خاطر یہ گروہ مختلف حربے استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور کافی حد تک اس میں کامیابی حاصل کرلیتا ہے۔

اس ناسور مرض کی نشاندہی اس امت کے منصبِ فقاہت پر فائز نبی ﷺ کے جلیل القدر صحبت یافتہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہوئے، فرماتے ہیں:

"قَالَ مَعَاذٌ: یُفْتَحُ الْقُرْآنُ عَلی الناسِ حَتٰی یَقْرأَ المرأةُ والصَّبِیُّ وَالرَّجُلُ، فَیَقُوْلُ

الرَّجُلُ: قَدْ قَرَأْتُ القرآنَ فَلَمْ أُتَّبَعْ، وَاللّٰهِ لَأَقُوْمَنَّ بِهٖ فِيْهِمْ لَعَلِّيْ أُتَّبَعُ، فَيَقُوْمُ بِهٖ فِيْهِمْ فَلَا يَتَّبِعُ، فَيَقُوْلُ: قَدْ قَرَأْتُ الْقُرْآنَ فَلَمْ أُتَّبَعْ، وَقَدْ قُمْتُ بِهٖ فِيْهِمْ فَلَا أُتَّبَعُ، لَأَحْتَظِرَنَّ فِيْ بَيْتِيْ مَسْجِدًا لَعَلِّيْ أُتَّبَعُ، فَيَحْتَظِرُ فِيْ بَيْتِهٖ أُتَّبَعُ، وَقَدْ احْتَظَرْتُ فِيْ بَيْتِيْ مَسْجِدًا فَلَمْ أُتَّبَعْ، وَاللّٰهِ لَآتِيَنَّهُمْ بِحَدِيْثٍ لَايَجِدُوْنَهٗ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ وَلَمْ يَسْمَعُوْهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ لَعَلِّيْ أُتَّبَعُ - قَالَ مَعَاذٌ: لَايَجِدُوْنَهٗ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ وَمَاجَاءَ بِهٖ؛ فَإِنَّ مَاجَاءَ بِهٖ ضَلَالَةٌ-"(۲)

ترجمہ: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا اس قدر عام ہوجائے گا کہ عورت بچہ اور ہر شخص اس کو با آسانی پڑھ سکے گا، ایسے میں وہ شخص کہے گا کہ میں نے قرآن کا علم حاصل کیا؛ مگر مجھے مقتدا نہیں بنایا گیا، سو اب میں ان کے درمیان نماز ومحافل میں اس کا خوب اہتمام کروں گا، شاید لوگ میری سربراہی کے قائل ہوجائیں۔ سو وہ شخص اس کا بھرپور انداز سے اہتمام کرے گا؛ مگر پھر بھی اس کی پیروی نہ کی جائے گی۔ تب وہ (لوگوں کو دکھڑا سناتے ہوئے کہے گا کہ) میں نے قرآن کا علم حاصل کیا؛ مگر لوگوں نے توجہ نہ دی، پھر میں نے اس قرآن کو نماز ودیگر محافل میں بھرپور انداز سے پیش کیا، مگر پھر بھی میری اقتدار کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ اب میں اپنے گھر میں مسجد بنا بیٹھتا ہوں، شاید اس سے لوگ میری اہمیت ومنزلت کو جان لیں، بہرحال وہ گھر میں مسجد قائم کرکے خلوت وعزلت نشینی سے توجہ حاصل کرنے کی ہمہ تن کوشش کرے گا؛ مگر اس کے باوجود اس کو کوئی نہ پوچھے گا۔ پھر کف افسوس ملتا ہوا کہے گا کہ میں نے تو گھر میں مسجد تعمیر کرکے خلوت نشینی کا ڈھونگ رچایا؛ مگر پھر بھی کسی نے قبول نہ کیا۔ اچھا اب میں ایسی باتیں لاؤں گا جن کی اصل نہ اللہ کی کلام میں ملتی ہوگی اور نہ رسول ﷺ کے ارشادات میں، شاید اس حربہ سے مجھے مرجعِ خلائق بنالیا جائے گا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جن باتوں کی اصل قرآن وسنت میں نہ ملتی ہو، ان سے خبردار رہو؛ کیونکہ وہ سراسر گمراہی کا راستہ ہے۔

ذرا ملاحظہ فرمائیں! حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جس دور میں یہ بات ارشاد فرمائی اور جس مرض کی تشخیص فرمائی وہ خیر القرون کا زمانہ تھا جہاں اس قسم کے مریض پیدا نہ ہوئے تھے، جہاں حضراتِ صحابۂ کرام کا وجود روشنی کی مانند تھا، جہاں اخلاص وللّٰہیت کی فراواں دولت سے قلوب مالا مال تھے؛ مگر جوں جوں زمانہ گرزتا گیا، خلوص وللّٰہیت کا سرمایہ گراں مایہ کم ہوتا گیا، خوفِ خدا کی جگہ ہوائے نفس نے پکڑنی شروع کی۔ الغرض زمانہ خیر القرون سے جس قدر بُعد ودوری پیدا ہوتی گئی تشخیصِ امراض نہایت متعذر رہوتا گیا۔

اس حوالہ سے ماضی قریب کے صاحب علم وقلم مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ (متوفی :2013ء) اپنے مجلّہ کے اداریہ میں رقم طراز ہیں:

''ہم اس دور میں عرصہ سے یہ تماشہ دیکھ رہے ہیں کہ جو کوئی حوصلہ منداور ذہین ہوا، اس کے پیٹ میں پہلے یہی درد اٹھتا ہے کہ لوگ اس کی پیروی کیوں نہیں کرتے، پھر وہ الٹے سیدھے نظریات وضع کرتا ہے اوران پر ایسا اصرار کرتا ہے کہ جیسے اگر انہیں تسلیم نہ کیا جائے تو اسلام کی عمارت ہی منہدم ہوکر رہ جائے گی، ایسے لوگوں سے ہمیشہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے، (چونکہ) ہر چمکدار چیز سونا نہیں ہوتی۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست (نہ معلوم کتنے ہی ابلیس انسانی شکل کے ہیں)

مگر عمومی طور پر سطحیت بڑھ گئی ہے، جہاں کوئی نیا نعرہ لگتا ہے، ایک بھیڑ جمع ہوجاتی ہے۔''(۳)

تفرد وشذوذ کی حقیقت

تفرد کسی بھی فقیہ وعالم کی اس رائے کو کہتے ہیں جس میں وہ شخص جمہور امت سے منفرد الگ موقف پر قائم ہو، اور جمہور علماء نے اس کو قبول عام نہ بخشا ہو۔ بہرصورت اس طرح کے تفردات ہمیں تقریباً ہر فقیہ سے متعلق مل جاتے ہیں؛ لیکن مسائل میں تفرد کے باوجود سلف صالحین کی جانب سے اس پر اصرار دکھائی نہیں دیتا، انہوں نے ان شذوذ کو عوام میں انتشار کا ذریعہ نہیں بنایا؛ بلکہ ہمیشہ جمہور کی پیروی پر آمادہ کیا۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جب سے ابلاغ وترسیل کے ذرائع عام ہوئے، اور سوشل میڈیا کی شکل میں ہر بندر کے ہاتھ ماچس تھمادی گئی، تب سے آزادی اظہار خیال کے خوش نما خول و دلفریب نعروں کی گونج میں ہر کہہ ومہہ مختلف شیطانی ہتھکنڈوں کا استعمال کرکے عوام کو گمراہی کے دہانے پر پہنچانے کی تاک میں بیٹھا ہے، انہی نادیدہ دانشور حضرات کے شذوذ وتفرد سے احتیاط برتنے سے متعلق معاویہ بن قرۃ فرماتے ہیں:

"إِيَّاكَ وَالشَّاذَ مِنَ الْعِلْمِ"(۴) علمی تفرادت سے خود کو بچاؤ!

چنانچہ حافظ ابن حجرؒ "التلخيص الحبير" میں بحوالہ ''معمر'' لکھتے ہیں:

"لَوْأَنَّ رَجُلًا بِقَوْلِ أهلِ المدينةِ في استماعِ الْغنٰى وَإتيانِ النساءِ فِي أدبارِهِنَّ، وَبِقَوْلِ أهلِ الكوفةِ في الْمُسْكِرِ: كَانَ شَرَّ عبادِ اللّٰهِ"(۵)

ترجمہ: اگر کوئی شخص اہل مدینہ کی وجہ سے گانے اور بیوی کے قریب غیر فطری راستے سے جانے کے جواز کا قول اختیار کرے، اور اہل کوفہ کی وجہ سے مُسکر کو حلال پیش کرے تو مخلوق خدا میں بدترین شخص ہے۔

ذوقِ تفرد کے نقصانات

جمہور امت کی رائے کے برعکس راہِ تفردات اختیار کرنا ایک بڑے خطرے اور فتنے کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہے، اور اس پُر خار وادی میں قدم رکھنا ہی نہایت نقصان دہ عمل ہے؛ چنانچہ بسا اوقات ذوقِ انفرایت کا یہ بڑھتا رجحان ہوائے نفس کے داؤ پیچ میں الجھا کر علمی زلّت ولغزش کا باعث واقع ہوتا ہے، جس کی شرانگیزی اور نقصان کا ذکر ابوالحسن کرابیسیؒ نے سوال وجواب کی صورت اختیار کرکے یوں ذکر کی ہے:

"فَإِنْ قَالَ قَائِلٌ: هؤلَاءِ مِنْ أَهْلِ العلمِ!، قِيْلَ لَهُ: إِنَّمَايَهْدِمُ الإسلامَ زلةُ عالمٍ، وَلَايَهْدِمُ زَلَّةُ أَلْفِ جَاهِلٍ". (۶)

اگر کوئی معترض یوں کہے: (یہ شاذ رائے پیش کرنے والے) یہ سب تو اہل علم ہیں۔! (جس کا نقصان بھلا کیسے متعدی ہوسکتا ہے؟) جواب دیا جائے گا کہ اسلام کی قائم شدہ عمارت کو منہدم کرنے کا مؤثر سبب تو عالمِ دین کی لغزش ہی ہوسکتی ہے، باقی جاہل شخص کی ہزار لغزش سے بھی اس کو نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

اسی نقطۂ نظر کی حساسیت کو حسی مثال سمیت پیش کرتے ہوئے حافظ ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں:

"شَبَّهَ الْحُكَمَاءُ زَلَةَ الْعَالِمِ بِانْكِسَارِ السَّفِينَةِ؛ لِأَنَّهَا إِذَا غَرَقَتْ غَرِقَ مَعَهَا خَلْقٌ كَثِيرٌ"(۷)

عالم کی لغزش وزلت کو حکماء نے کشتی کے ٹوٹنے سے تشبیہ دی ہے؛ اس لیے کہ کشتی کا ٹوٹنا بہت سے انسانوں کو ڈبو دیتا ہے۔

معاشرتی واجتماعی زندگی پر اثرات ونتائج

اس ناسور مرض کے معاشرتی واجتماعی زندگی پر وارد چند مضرات پیش خدمت ہیں:

۱- دنیا میں معرضِ وجود میں آنے والے فرقوں کی ایک بڑی تعداد کسی نہ کسی اہلِ علم کے تفرد پر قائم ہے، جس سے فرقہ پرست افراد موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے ایک نئے فرقے کی بنیاد رکھتے ہیں۔

۲- اس راہ کا اختیار کرنا عام طور پر سلف بیزاری کے شکنجہ میں گرفتار کر کے ترکِ تقلید کے مراحل عبور کرتا ہوا بسا اوقات الحاد وزندقہ کی دہلیز پر کھڑا کر دیتا ہے، جس کے بعد تنقید کے دوہرے معیار کا حامل یہ شخص اکابر سے سوءظن اور توہین آمیز کلمات کے استعمال کو ''علمی تحقیق'' کا لبادہ اوڑھانے کی ناکام کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے۔

۳- راہِ تفرد کا اختیار کرنا عام طور پر ایک عادت کی صورت اختیار کر لیتا ہے، حتی کہ وہ درجنوں مسائل میں تفرد اختیار کرتا چلا جاتا ہے، اور اس غلو میں حد درجہ آگے بڑھنے کے نتیجہ میں بسا اوقات اجماعی مسائل میں بھی متفرد ہو جاتا ہے۔

۴- اس راہ کا مسافر اکثر و بیشتر اسی سوچ وفکر میں مبتلا دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے متفرد مسئلہ کو قرآن وحدیث وعلماء اسلام کی عبارات سے مطلب کشید کر کے اپنے تفرد کو جمہور امت کی رائے پر فوقیت وبرتری دینے کی ناکام کوشش کرتا ہے، جو کسی منصف مزاج کے نزدیک درست اقدام نہیں۔

۵- اپنے تفرد کے ناموافق دلائل کی غیر موزوں تاویل کے سبب وہ شخص علماء حق کی نگاہوں میں مطعون ہو جاتا ہے، اور حد عبور کر دینے کی صورت میں وہ شخص امت مسلمہ کا شیرازہ بکھیرنے کا سبب بن جاتا ہے، جو باطل پرست افراد کا وطیرہ ہے۔

حق وباطل کی معرفت کا طریقۂ کار

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اس حوالے سے فرماتے ہیں:

''دانشور شخص کی ایسی مشتبہ باتوں سے خود کو محفوظ رکھو جس پر انسان کا ضمیر کہتا ہے کہ یہ کیسی بات کہہ رہا ہے؟ البتہ یہ چند انوکھی باتیں اس کی دیگر باتوں سے دور نہ کریں؛ چوں کہ ممکن ہے کہ وہ اس گمراہ کن بات سے رجوع کر کے حق بات بیان کرے؛ چوں کہ حق بات نورانیت سے معمور ہوتی ہے۔''(۸)

اس کی توضیح کرتے ہوئے علامہ بیہقیؒ فرماتے ہیں:

''حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی اس نصیحت کا حاصل یہ ہے کہ دانشور شخص کی لغزش اس کی ذات سے اعراض کا سبب واقع نہ ہو؛ لیکن ایسی بات سے خود کو بچایا جائے جس سے نورانیت کے بجائے ظلمت کی وحشت محسوس کی جاتی ہو؛ چوں کہ حق بات قرآن وسنت سے مبرہن نور کا سرچشمہ ہوتی ہے۔''(۹)

اللہ تعالی ہم سب کو جمہور امت، سلف صالحین اور اکابر بزرگانِ دین کی سچی پیروی نصیب فرمائے اور انھیں کے نقش قدم پر چل کر کتاب وسنت، اجماع اور قیاس شرعی پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور ہر قسم کی بے راہ روی اور ذہنی آوارہ گردی اور اسلاف بیزاری سے محفوظ رکھے! آمین!

❊ ❊ ❊

حواشی

(۱) ابن ماجه، كتاب الفتن، باب السواد الاعظم، حديث نمبر 3950، ط: دار احياء كتب العربية، 2/1303

(۲) سنن دارمی،باب تغير الزمان وما يحدث فيه،1/284، دار المغنى للنشر والتزيع، حديث نمبر :205

(۳) حدیث دردِدل، مجلّہ المآثر اور ماہنامہ ضیاء الاسلام کے اداریوں کا مجموعہ، مؤلف: مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی، مکتبہ ضیاء الکتب، صفحہ 30

(۴) شرح علل الترمذى لابن رجب الحنبلى، 2/625،مكتبة المنار

(۵) التلخيص الحبيرفى تخريج احاديث الرافعى الكبير، لابن حجر العسقلانى، 3/398، دار الكتب العلمية، حديث نمبر: 1543

(۶) طبقات الشافعية الكبرى تاج الدين سبكى، 2/125، هجر للطباعة والنشر والتوزيع

(۷) جامع بيان العلم وفضله، ابن عبدالبر، 2/982، دار ابن الجوزى، نمبر 1873

(۸) سنن ابى داؤد، كتاب السنة، باب لزوم السنة، 4/202،المكتبة العصرية، 4611

(۹) الاعلام بحرمة أهل العلم والاسلام،محمد اسماعيل مقدم، 1/367، دار الايمان للطبع والنشر والتوزيع

❊ ❊ ❊

کتب سابقہ پر مولانا عبدالحق حقانی کی آراء کا تجزیہ

(۲/۱)

از: ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی

مولانا ابومحمد عبدالحق حقانی دہلوی (۱۲۶۵-۱۳۳۶ھ) ہندوستان کی ایک نمایاں اور علمی وتحقیقی شخصیت ہیں، انھوں نے علومِ قرآن کی ترویج واشاعت میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ ان کی قرآنی بصیرت وتدبر کا اندازہ ان کی متداول تفسیر فتح المنان سے لگایا جاسکتا ہے، جو تفسیر حقانی کے نام سے معروف ہے۔ یہ تفسیر اردو زبان میں بڑی اہمیت کی حامل ہے، اس کی چند خصوصیات کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱- آیات میں ربط پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

۲- شان نزول میں روایت صحیحہ کا التزام کیا گیا ہے

۳- روایت اور درایت کو اس فن کے ماہرین سے اخذ کیا گیا ہے۔

۴- آیات احکام میں اول مسئلۂ منصوصہ کو ذکر کرکے پھر اختلاف مجتہدین اور ان کے دلائل کی وضاحت کی گئی ہے۔

۵- قصص میں جو کچھ روایت صحیحہ یا کتب سابقہ سے ثابت ہے یا خود قرآن میں جو کچھ وارد ہے اس کو بیان کردیا ہے۔

۶- مخالفین کے شکوک وشبہات جس قدر تاریخی واقعات یا مبدأ ومعاد کی بابت کیے جاتے ہیں سب کا جواب تحقیقی اور الزامی دیا گیا ہے۔

۷- تکرار، رطب ویابس اور کسی خاص مذہب کی تائید میں غلو سے اجتناب ہے اور مذاہب کا تقابل مطالعہ کرنے کے بعد قرآن مجید کی حقانیت کو واضح کیا گیا ہے۔

۸- بائبل اور دوسری مذہبی کتابوں سے تقابلی مطالعہ اور سرسید احمد خان کی فکر کا تعاقب اس تفسیر کا

خاص موضوع ہے۔

۹-علمائے کرام اور عربی داں حضرات کے لیے آیات کی تفسیر سے پہلے ترکیب نیز صرفی، نحوی، لغوی، تشریح وتحقیق مزید اہمیت دوچند کرتی ہے۔

یہاں ہم اس مضمون میں مولانا حقانی کے ان مباحث کو پیش کریں گے جو تقابل ادیان، مطالعہ ادیان سے وابستہ ہیں۔

ادیان و مذاہب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک سامی ادیان (Semitic religions) دوسرے غیر سامی ادیان (Non Semitic religions) ہر ایک صاحب مذہب کا دعویٰ ہے کہ اس کے پاس عوامی فلاح وصلاح کے لیے دینی یا مذہبی کتب موجود ہیں۔ مثلاً جن مذاہب نے ہندوستان میں نشو ونما پائی اور جن کا عروج وزوال اسی سرزمین پر ہوا، جنہیں ہم ہندوستانی مذاہب یعنی (Indic Religions) کہتے ہیں ان کا بھی دعویٰ یہی ہے کہ ہمارے یہاں صحیفے یا کتب موجود ہیں جو سماجی اصلاح، تہذیبی خوبیوں کے علمبردار ہیں ان کی اتباع معاشرے کے لیے ضروری ہے۔ ہندوستان میں اہل ہنود یعنی ہندوؤں کا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارے مذہب کا شروتی ادب الہامی ہے جس میں وید وغیرہ آتے ہیں۔ یہ دعویٰ ہندو علماء خصوصاً آریہ سماجی محققین کا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خود ہندو باحثین اور علماء نے ویدوں کو الہامی ہونے سے انکار کیا ہے۔ بہرحال یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے۔ اسی طرح سامی ادیان کی اتباع کرنے والے یہود ونصاریٰ اور مسلمان ہیں ان تینوں ادیان کے ماننے والوں کا دینی ادب الہامی اور منزل من اللہ ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ توراۃ، انجیل اور زبور جو کہ آسمانی کتابیں ہیں کیا وہ جوں کی توں باقی ہیں یا پھر ان میں علماء بنی اسرائیل نے خرد برد کرڈالی ہے؟ یہ بدیہی صداقت ہے کہ آج توراۃ، انجیل اور زبور کے نام پر جو دینی یا مذہبی لٹریچر موجود ہے وہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں ہے۔ اس میں لوگوں نے خرد برد کرڈالی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی مبنی برحق ہے کہ تمام اہل اسلام کو ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ تمام آسمانی کتب اور صحائف پر ایمان لانے کا جو مفہوم ومقصود ہے اسے ہم سب جانتے ہیں اس کی وضاحت کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

اسی مفہوم کو مولانا عبدالحق حقانی نے اپنی معروف تفسیر، تفسیر حقانی میں لکھا ہے۔

''واضح ہو کہ قرآن مجید میں اکثر جگہ توراۃ وانجیل وزبور وصحف ابرہیم علیہ السلام وغیرہ کا ذکر آیا ہے اور ان کی مدح اور تصدیق اور کتاب الٰہی ہونا بیان کیا ہے اور بعض مضامین کا حوالہ ان کی طرف دیا ہے؛ اس لیے جمہور اہل اسلام کے نزدیک ان پر ایمان لانا ضروری ہے، جمیع انبیاء اور تمام کتبِ الٰہیہ کو

بلاتفریق حق سمجھنا خاص اہل اسلام کا ہی حصہ ہے‘‘ (حقانی، ابومحمد عبدالحق، تفسیر حقانی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، جلد۱، صفحہ۱۷۴) یعنی قران نے جن کتابوں اور صحیفوں کا ذکر کیا ہے ان پر ایمان لانا اور انھیں حق تسلیم کرنا اہل اسلام کے ایمان ویقین کا حصہ ہے۔ اس مفہوم کو قرآن میں متعدد جگہ پر بیان کیا گیا ہے اور بیشتر آیات میں کتب سماویہ پر ایمان کی بات موجود ہے۔

قرآن وحدیث اور اسلامی مصدر یا کہیے نص قطعی یعنی قرآن نے جن آسمانی کتابوں کا ذکر کیا ہے وہ اپنی اسی صورت وہیئت میں موجود ہیں جس طرح آسمان سے نازل ہوئی تھیں؟ عہد حاضر کا یہ ایک بڑا مسئلہ اور اہل اسلام کے لیے بڑا چیلنج ہے؛ چنانچہ علمائے اسلام مثلاً علامہ تیمیہ نے "الجواب الصحیح لمن بَدَّلَ دینَ المسیح" اور علامہ ابن قیم نے "هداية الحيارىٰ على أجوبَةِ اليهودِ والنصارىٰ" میں اس حوالے سے تفصیلی گفتگو موجود ہے؛ لیکن یہاں علامہ حقانی کی تفسیر حقانی کا تجزیہ پیش کرنا مقصود ہے؛ اس لیے ان سطور میں ان کی ارا نقل کی جائیں گی۔ تفسیر حقانی کے مصنف اپنی کتاب کے مقدمے میں کتب سماویہ پر بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس تفصیلی گفتگو سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کے مشمولات ومحتویات پر روشنی ڈال دی جائے۔

عہد نامۂ قدیم رتورات کا تعارف

یہاں بائبل سے کیا مراد ہے اس کو بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

کتاب مقدس، لفظ بائبل لفظ (Bible) کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ عہد نامۂ قدیم یا عتیق (Old Testament) اور عہد نامہ جدید (New testament) کے مجموعے کا نام ہے۔ جس کو عصر حاضر کے یہودی اور عیسائی آسمانی والہامی کتاب سمجھتے ہیں۔ نیا عہد نامہ یا انجیل خالصتاً عیسائیوں کی مقدس کتاب ہے۔ پروٹسٹنٹ فرقے کے یہاں اس کے اردو ترجمہ کا نام کتاب مقدس ہے اور اس میں چھیاسٹھ کتابیں شامل ہیں؛ جب کہ کیتھولک فرقہ کے یہاں اس کا اردو نام کلام مقدس ہے جو بہتر (۷۲) کتب پر مشتمل ہے۔ لفظ بائبل (Bible) دراصل یونانی لفظ ہے ’’بلیا‘‘ بمعنی کتاب سے بنا ہے۔ عہد عتیق، خدا اور اس کی منتخب قوم یہود کے درمیان اور عہد جدید خدا اور بنی اسرائیل یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عام انسانیت سے خدا کے میثاق، عہد، قانون اور شریعت کو کہا جاتا ہے یعنی وہ عہد اور قانون جو اس نے انبیاء اور مقدسین کی معرفت بنی اسرائیل یا انسان پر عائد کیا۔ (خالد محمود مدنی، برصغیر کا تفسیری ادب اور کتاب مقدس۔ صفحہ۱۶)

اس کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عہد نامۂ قدیم کا بھی تعارف کرادیا جائے؛ چنانچہ خالد محمود

مدنی اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں رقم طراز ہیں۔

''تمام عیسائی پرانے عہد نامہ کے مشمولات پر متفق نہیں۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کے عیسائی عہد قدیم کی انتالیس کتب کو معتبر مانتے ہیں، جو یہودیوں کے نزدیک معتبر اور الہامی ہیں؛ جب کہ رومن کیتھولک، اینگلی کان اور مشرقی کلیسا سے متعلق عیسائی، کچھ مزید کتابوں کو مقدس اور پرانے عہد نامہ کا ضروری حصہ تصور کرتے ہیں۔ یہودی اور پروٹسٹنٹ عیسائی ان کتابوں کو غیر الہامی، غیر مستند اور متروک خیال کرتے ہوئے، انھیں اپوکریفہ (Apocrypha) یعنی عام لوگوں سے مستتر اور پوشیدہ دستاویزات کا نام دیتے ہیں۔ ان زائد کتابوں کی تعداد میں بھی اختلاف موجود ہے۔ رومن کیتھولک کی مستند بائبل میں ۳۹ کتابوں کے علاوہ اپوکریفہ کی سات (وہ سات کتابیں یہ ہیں۔ کتاب ۱۷-طوبیاہ، ۱۸- یہودیت، ۲۵-حکمت، ۲۶- یشوع بن سیراخ، ۳۰- باروک، ۴۵- مکابین، ۴۶- مکابین جو نمبر دیا گیا ہے یہ کتب اسی ترتیب سے کیتھولک نسخہ میں شامل ہیں) کتابوں کو شامل کر کے ۴۶ کتابوں پر مشتمل عہد نامہ کو مستند الہامی قرار دیا گیا ہے؛ جب کہ ایک مشہور نسخہ موسوم بہ نسخہ اسکندریہ کے مطابق پرانے عہد نامہ کی کتب کی تعداد پچاس ہے۔ دراصل حقیقت یہ ہے کہ پرانے عہد نامہ کے مستند نسخہ کی تدوین کا کوئی قابل اعتماد ریکارڈ ہی موجود نہیں ہے۔ پروٹسٹنٹ عیسائی عام طور پر عہد نامۂ قدیم کی کتب کی تقسیم اس طرح کرتے ہیں۔ تاریخی کتب سترہ، شعری مجموعے پانچ اور انبیاء کی کتب سات، اس طرح یہ کل تعداد چھیاسٹھ ہوئی۔ شروع شروع میں بائبل ابواب اور آیات میں تقسیم نہیں تھی۔ تلمود کے زمانہ ۲۰۰ء سے بھی پہلے یہودی علماء نے حوالہ جات آسانی سے تلاش کرنے کی غرض سے پرانے عہد نامہ کو ابواب اور آیات میں تقسیم کیا اور یہی تقسیم آج تک مروج ہے اور نئے عہد نامہ کی ابواب میں تقسیم والا پہلا نسخہ ۱۵۵۱ء میں پیرس کے رابرٹ سٹیفن نے اپنے چھاپہ خانے سے شائع کیا جو آج تک اسی ترتیب سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے کل ابواب ۱۱۸۹، کل آیات ۳۱۱۰۲، کل کتب علی حسب اختلاف (۲۷-۳۹-۶۶) ہیں۔ بائبل کا پہلا جزوی اُردو ترجمہ ۱۷۴۵ء میں شائع ہوا جو جرمن مشنری شلٹز نے کیا اور مکمل ترجمہ ۱۸۴۳ء میں بنارس کمیٹی کی طرف سے شائع کیا گیا'' (ایضاً، صفحہ ۱۶-۱۷)

عہد نامۂ قدیم اور بائبل کے اس مختصر تعارف کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حقانی نے عہد نامۂ قدیم میں جن کتابوں کو شامل کیا ہے ان کو ذیل میں پیش کر دیا جائے۔

عہد نامۂ قدیم یعنی Old Testament جسے عام زبان میں تورات بھی کہا جاتا ہے، اس کا

تعارف یا اس کے محتویات میں کیا کیا شامل ہے اس پر گفتگو کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ کتب سماویہ کے تعارف میں رقم طراز ہیں۔

اہل کتاب اپنی تمام کتب سماویہ کے مجموعے کو بائبل کہتے ہیں۔ پھر اس کے دو حصے ہیں ایک عہد عتیق یعنی پرانی کتابیں دوسرا عہد جدید۔ پہلے حصے میں یہ کتابیں ہیں۔(۱) سفر خلیقہ کہ جس کو کتاب پیدائش بھی کہتے ہیں اس میں ابتداء پیدائش آسمان و زمین کے حال سے لے کر حضرت موسیٰ تک سلسلہ وار تاریخ کا بیان ہے۔(۲) سفر خروج جس میں بنی اسرائیل کا مصر سے نکلنے وغیرہ امور کا ذکر ہے۔(۳) کتاب احبار جس میں قربانی اور قصاص اور جانوروں کی حلت وحرمت وغیر ہا احکام ہیں۔ (۴) سفر عدد جس کو گنتی کی کتاب کہتے ہیں اس میں بنی اسرائیل کے فرقوں کا شمار ہونے کا اور دیگر بیان ہے۔(۵) سفر استثناء اس میں ملک فلسطین کی تقسیم وغیرہ امور ہیں، ان پانچوں کو توراۃ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصنیف کہتے ہیں۔(۶) کتاب یشوع۔(۷) قاضیوں کی کتاب۔(۸) راعوث یا روت کی کتاب یہ تین ورق میں الیملک اور اس کی جورو نعومی کا قصہ ہے۔(۹) صموئیل کی اول کتاب (۱۰) صموئیل کی دوسری کتاب (۱۱) سلاطین کی پہلی کتاب (۱۲) سلاطین کی دوسری کتاب (۱۳) اول کتاب تواریخ۔(۱۴) دوسری کتاب تواریخ کہ جس کو اخبار الایام بھی کہتے ہیں (۱۵) عزرا کی کتاب اول (۱۶) عزرا کی دوسری کتاب کہ جس کو کتاب نحمیاہ بھی کہتے ہیں (۱۷) کتاب ایوب (۱۸) زبور داؤد علیہ السلام اس میں محض مناجات اور خدا کی مدح وثنا ہے (۱۹) امثال سلیمان علیہ السلام اس میں پند ونصائح ہیں (۲۰) کتاب واعظ جس کو جامع بھی کہتے ہیں (۲۱) غزل الغزلات کہ جس کو نشید انشاد بھی کہتے ہیں، یہ پانچ چھ ورق کا رسالہ ہے جس میں عاشقانہ مضامین؛ بلکہ بعض فحش آمیز کلمات بھی ہیں (۲۲) یسعیاہ نبی کی کتاب (۲۳) یرمیاہ نبی کی کتاب (۲۴) یرمیاہ نبی کا نوحہ یا مرثیہ تین چار ورق میں ہے۔(۲۵) حزقیل کی کتاب (۲۶) دانیال علیہ السلام کی کتاب (۲۷) ہوسیع نبی کی کتاب (۲۸) یوئیل نبی کی کتاب یہ صرف دو ورق میں میں ہے۔(۲۹) عاموس نبی کی کتاب یہ کل چار ورق کی ہے جس میں کچھ پیشین گوئیاں ہیں (۳۰) عبدیاہ نبی کا خواب جو ایک صفحہ پر ہے (۳۱) کتاب یونہ یعنی یونس علیہ السلام کا ڈیڑھ ورق پر مختصر سا حال (۳۲) میخایامیکہ علیہ السلام کا چار ورق پر الہامی بیان ہے (۳۳) ناحوم علیہ السلام کا الہام جو نینوہ شہر کی نسبت ہے دو ورق میں (۳۴) حبقوق نبی کا الہام جو دو ورق پر ہے (۳۵) صفنیاہ یا صفونیاہ نبی کا الہام جو دو ورق پر ہے (۳۶) حجی نبی کا الہام جو دارا شاہ ایران کے عہد میں ہوا ایک ورق پر ہے (۳۷) زکریا علیہ السلام کا

الہام جودارا کے عہد میں ہوا تھا آٹھ ورق پر (۳۸) ملاخیایاملا کی نبی کا الہام جس میں الیاس کے آنے کی بھی خبر ہے۔ یہ اڑتیس کتابیں وہ ہیں جن کو یہود اور نصاری سب مانتے ہیں؛ مگر فرقہ سامریہ ان میں سے صرف توراۃ اور کتاب یوشع اور کتاب القضاۃ کو مانتے ہیں باقی سب کے منکر ہیں؛ لیکن عیسائیوں نے نو اور کتابیں اس مجموعہ میں داخل کی ہیں کہ جن کی تسلیم وعدم تسلیم میں ان کے متقدمین و متاخرین میں سخت اختلاف ہے۔ وہ نو کتابیں درج ذیل ہیں۔ (۱) کتاب آستر یہ پانچ ورق کا ایک دلچسپ قصہ آستر یہودیہ کا ہے۔ (۲) کتاب باروق۔ (۳) ایک حصہ کتاب دانیال کا (۴) کتاب توبیاس (۵) کتاب یہودیت (۶) کتاب وزدم (۷) کتاب ایکلیز یاستیکس (۸) مقابیین کی اول کتاب (۹) مقابیین کی دوسری کتاب۔ یہود متذکرہ نو کتابوں کو لغو قصے سمجھتے ہیں؛ مگر عیسائیوں نے الہامی مانا ہے۔ (ایضاً، ۱۷۴-۱۷۵)

قارئین کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ توارۃ جسے کہا جاتا ہے اس کے اندر کتنی کتابیں ہیں۔ گویا توراۃ کا یہ تعارف تھا۔ اب ذیل میں دیگر علمی اور تحقیقی مباحث کو پیش کیا جائے گا۔

بالائی سطور میں جن کتابوں کا تذکرہ کیا ہے ان کو عہد عتیق یعنی اولڈ ٹیسٹامنٹ میں شامل کیا جاتا ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے عہد عتیق کے نام سے جو کتاب ہمارے دور میں پائی جاتی ہے جس کی اصل زبان عبرانی ہے اس کے کئی زبانوں میں تراجم بھی ہوئے ہیں۔ کیا یہ کتاب تحریف ہوچکی ہے یا من وعن وہی ہے جس طرح نازل ہوئی ہے۔ اس حوالے سے سطور ذیل میں مولانا حقانی کی رائے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی کہ آیا موجودہ توراۃ کو وہ محرف مانتے ہیں یا نہیں؟

توراۃ کی تحریف کے شواہد

قرآن کریم کے علاوہ جتنی بھی آسمانی کتابیں ہیں ان کے متعلق معتدل مفکرین ومحققین کی آراء یہی ہیں کہ وہ سب کی سب تحریف وترمیم کا شکار ہیں؛ البتہ اس معاملے میں یہودی توراۃ کو الہامی بتاتے ہیں اور انھوں نے اس کے باقاعدہ دلائل دیے ہیں؛ لیکن یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ یہ کتابیں اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں ہیں۔ علماء یہود نے انھیں تبدیل کیا اس کے ثبوت اسلامی نصوص میں صراحت کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان تمام شواہد وبراہین سے قطع نظر توراۃ کی تحریف پر مولانا عبدالحق حقانی کی آراء کا تجزیہ پیش ہے۔

مولانا اپنی کتاب ''تفسیر حقانی'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

''قسیس نورٹن کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں کاغذ نہ تھا؛ یہاں تک کہ

حضرت مسیح کے کئی سو برس بعد کاغذ ایجاد ہوا اور لکھنے کا دستور جاری ہوا؛ چنانچہ اس ہسٹری میں کہ جو ۱۸۵۰ء میں لندن مطبع چارلس ڈالین میں چھپی ہے لکھا ہے کہ اول زمانہ میں سلائیوں سے تختوں پر حروف نقش کیا کرتے تھے پھر سب اول مصر والے درخت پیپرس کے پتوں پر لکھنے لگے پھر بلدہ پرگس میں خس کی وصلی ایجاد ہوئی اور آٹھویں صدی میں روئی اور ریشم کا کاغذ تیار ہوا'' (ایضاً، صفحہ ۱۷۷-۱۷۸)

اس بات سے مولانا حقانی کا قیاس یہ ہے کہ جب لکھنے کا رواج ہی نہ تھا تو توراۃ یقیناً لکھی نہیں ہوگی، زبانی سکھائی گئی ہوگی۔ اسی طرح آگے رقم طراز ہیں:

''توراۃ مطبوعہ ۱۸۳۵ء میں یہ ہے کہ مذبح کے تمام پتھروں پر وضاحت سے تمام توراۃ کو لکھا تھا؛ چنانچہ نسخہ فارسیہ مطبوعہ ۱۸۴۵ء کی یہ عبارت ہے درانجا برس گہا نسخہ توراۃ موسیٰ را کہ در حضور بنی اسرائیل نوشتہ بود نوشت۔ آگے لکھتے ہیں اس وقت میں کاغذ نہ تھا اور اگر تھا تو بہت ہی کم اور کاغذ کی لکھی ہوئی بالخصوص ایسی ضخیم کتابیں کہ جیسے توراۃ ہے شاید تمام قوم میں ایک آدھ ہی نسخہ ہو اور حفظ کا رواج نہ تھا پس حضرت موسیٰ نے وہ نسخہ توراۃ (کہ جو کتاب الٰہی تھی خواہ بواسطہ جبرئیل علیہ السلام مع الفاظ حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی تھی یا بطور الہام کے انھوں نے لکھی تھی ہر چہ باشد) احبار کو دے دیا تھا اور انھوں نے صندوق شہادت میں رکھ دیا تھا اور سات برس کے بعد صندوق کھلتا اور یہودی عید کے روز اس کو سنتے تھے؛ چنانچہ حضرت یشوع تک یہی حال رہا پھر جب یہود میں انقلاب ہوا کہ کبھی مرتد ہوکر سالہا سال بت پرستی کرتے تھے اور کبھی اسلام لاتے تھے تو ان حوادث میں توراۃ جاتی رہی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ کب گئی؛ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ دو لوح برآمد ہوئیں کہ جن میں دس احکام لکھے ہوئے تھے؛ چنانچہ یہ بات اول کتاب السلاطین کے ۸ باب ورس ۹ سے ثابت ہے پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کی سلطنت کے دو ٹکڑے ہوگئے اور دونوں سلطنتوں میں کفر و بت پرستی نے تخمیناً ڈھائی سو برس تک وہ زور پکڑا کہ آخر کے عہد میں بعل بت کے لیے ہر جگہ مذبح بنائے گئے اور بیت المقدس کے دروازے بند ہوگئے اور اس عرصے میں دو بار حملے بھی ہوئے؛ چنانچہ ایک بار سلطان مصر نے چڑھائی کر کے بیت المقدس کو لوٹ کر تباہ کر دیا اور تمام چیزیں لے گیا اور ایک بار اسرائیل کا ایک مرتد بادشاہ چڑھ آیا اور اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ المختصر حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد سے تخمیناً چار سو برس تک یہ حال رہا کہ ایک مدت تک چند بادشاہ مشرک اور مرتد ہوکر دین موسوی کو برباد کرتے رہے اور بیچ میں ایک دو دین دار بھی ہوگئے آخر کار منسا کے عہد میں تو از حد کفر اور بت پرستی ہوئی؛ چنانچہ خاص بیت المقدس میں بت دھرے گئے؛ یہاں تک کہ یوسیاہ بن آمون

تخت پر بیٹھا اور صدق دل سے بت پرستی سے توبہ کر کے دین موسوی کی طرف متوجہ ہوا، توراۃ کو بہت ڈھونڈھا؛ لیکن باایں ہمہ اس کو توراۃ کا پتہ نہ ملا؛ مگر اٹھارویں سال خلقیاہ کاہن نے دعوی کیا کہ مجھ کو نسخہ توراۃ بیت المقدس میں سے دبا ہوا ملا اور اس نے بذریعہ سافن کاتب کے وہ نسخہ یوسیاہ کو دیا کہ جس کو سن کر یوسیاہ کو بنی اسرائیل کے گناہ پر بڑا رنج ہوا۔ (بظاہر سمجھ میں نہیں آتا کہ باوجود اس تجسس کے نہ بادشاہ کو نہ کسی اور کو بیت المقدس میں نسخہ توراۃ ملا خلقیاہ کو مل گیا پس قطعی یہ ہے کہ اتنی مدت تک خلقیاہ حضرت موسیٰ کے حالات و دیگر حکایات کو اپنے طور پر جمع کرتا رہا جب مرتب ہو گیا تو دعویٰ کیا) پس جب یہ بادشاہ مر گیا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا یہوآخز تخت پر بیٹھتے ہی مرتد ہو گیا اور کفر پھیلا دیا گیا؛ مگر اس کو تھوڑے ہی دنوں بعد شاہ مصر نے گرفتار کر لیا پھر اس کے بعد اس کا بھائی یہویقیم تخت پر بیٹھا وہ بھی مرتد ہوا اس کے بعد اس کا بیٹا یہویکین مرتد تخت پر بیٹھا تو بابل کا بادشاہ بخت نصر اس کو گرفتار کر کے لے گیا اور بیت المقدس کو خراب کر گیا اور اس کے چچا صدقیا کو اس کی جگہ قائم کر گیا پس جب اس نے بھی بخت نصر سے بغاوت کی تو دوبارہ بخت نصر نے چڑھائی کی پھر تو بیت المقدس کو بالکل منہدم کر دیا اور ہزارہا بنی اسرائیل کو تہ تیغ کیا اور بے شمار کو غلام بنا کے لے گیا اور جلیل و یروشلم کو بھی مسمار کر گیا اس حادثہ میں توراۃ (اگر فرض کیا جاوے کہ وہ باقی تھی ورنہ وہی تصنیف خلقیاہ) اور تمام کتابیں روئے زمین سے بالکل معدوم ہو گئیں؛ چنانچہ اس بات کا اہل کتاب کو اقرار ہے'' (ایضاً، صفحہ ۱۷۸-۱۷۹)

متذکرہ شواہد یا دلائل و براہین سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ توراۃ جو منزل من اللہ تھی حوادث زمانہ کی شکار ہو گئی۔ مولانا حقانی کی یہ رائے بھی درست معلوم ہوتی ہے کہ جس توراۃ کا دعویٰ خلقیاہ کاہن نے کیا تھا وہ خود اس کی اپنی تصنیف ہے۔ علاوہ ازیں دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ خلقیاہ نے جس توڑاۃ کا دعویٰ کیا تھا وہ وہی تھی جو آسمان سے اتری تھی تب بھی شک و ریب زائل نہیں ہوتا ہے؛ کیونکہ جس طرح حالات بدلے ہیں ان سے تو ایسا لگتا ہے کہ توراۃ بھی ان حالات کا شکار ہو کر گم ہو گئی۔

اس کے بعد یہ حقائق بھی ملاحظہ کرتے چلیں:

''پھر اس کے بعد حضرت عزیر علیہ السلام نے حضرت عیسی سے چار سو چھپن برس پیشتر پھر جو کچھ اپنی یاد پر لکھا تھا (کہ جس کو اہل کتاب توراۃ کہتے گو وہ بھی غلطی سے خالی نہ تھا کیوں کہ سفر اول اور دوم کتاب تاریخ کو حضرت عزیر نے بقول اہل کتاب حجی اور زکریا علیہ السلام کی مدد سے لکھا ہے

اس میں اولاد بنیامین کے بیان میں توراۃ کے خلاف کیا ہے توراۃ میں جو غلطی سے دس لکھ گئے ہیں ان کو کبھی تین اور پانچ بتلایا ہے) وہ شاہ انیٹوکس کی چڑھائی میں برباد ہوگیا، یہ حادثہ حضرت مسیح سے ایک سو اکسٹھ برس پیشتر یہود پر گزرا ہے اور ساڑھے تین برس تک رہا ہے جیسا کہ کتب تواریخ سے ظاہر ہے باب اول کتاب اول مقابیین میں یہ ہے کہ انیٹوکس شاہ فرنگ نے یروشلم پر چڑھائی کی اور عہد عتیق کی تمام کتابوں کو جلادیا اور حکم دیا کہ جس کے پاس یہ کتابیں نکلیں گی یا کوئی رسم شریعت بجالاوے گا قتل کیا جاوے گا اور ہر مہینہ میں تین بار خانہ تلاشی کرتا تھا۔ اور جان ملز کا تلک بھی اپنی اس کتاب میں جو ۱۸۴۳ء میں بلدہ ڈربی میں چھپی ہے اس کے ۱۱۵ صفحے میں لکھتا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اصل نسخہ توراۃ اور اسی طرح اصل نسخے اور عہد عتیق کے بخت نصر کے ہاتھ سے شہر یروشلم اور ہیکل کی بربادی کے وقت جاتے رہے اور صحیح نقلیں ان کی پھر عزرا کے طفیل سے بہم پہنچیں تو انیٹوکس کے حادثہ میں تلف ہوگئیں اور مسیح اور حواریوں کی شہادت بغیر ان کی تسلیم کی کوئی صورت نہ تھی'' (ایضاً، صفحہ ۱۷۹-۱۸۹) گویا یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ توراۃ کے اصل نسخے گردش ایام کی نذر ہوگئے۔ اسی طرح مولانا حقانی نے عہد عتیق کے تحریف ہونے کے کچھ داخلی شواہد پیش کیے ہیں جن سے یہ بات اور یقینی ہوجاتی ہے کہ واقعی ان کتابوں میں تحریف وتبدیل ہوئی ہے اور یہ الہامی یا منزل من اللہ کلام نہیں ہے۔

''(۱) ان کتابوں میں بہت سے ایسے مضامین پائے جاتے ہیں کہ جن سے خدائے پاک کی ذات مقدس میں اور اس کے ملائکہ کرام اور انبیاء علیہم السلام میں سخت عیب لگتا ہے اور کتب الٰہیہ کی شان سے یہ ناممکن ہے؛ کیوں کہ ان سے ہدایت مقصود ہوتی ہے نہ کہ ضلالت؛ پس ثابت ہوا کہ یہ الہامی نہیں ہے'' مولانا حقانی اپنے اس دعویٰ کی دلیل میں لکھتے ہیں:

''کتاب پیدائش کے باب ایک آیت چھبیس سے ثابت ہے کہ خدا تعالیٰ نے آدم کو اپنے ہم شکل بنایا اور کئی مقام سے بھی یہی ثابت ہے جس سے لازم آیا کہ خدا تعالیٰ مجسم اور حادث ہے۔'' اس قبیل کے چھ شواہد مولانا حقانی نے پیش کرکے اپنے دعویٰ کو مضبوط کیا ہے۔ ان تمام کو یہاں طوالت کی باعث ترک کیا جارہا ہے۔ ملائکہ کی بابت لکھتے ہیں:

ملائکہ کی نسبت کتاب پیدائش اٹھارویں باب آٹھویں آیت میں ہے کہ پھر اس نے گھی اور دودھ اور بچھڑے کو جو اس نے پکوایا تھا لے کے ان کے سامنے رکھا اور آپ ان کے پاس درخت کے نیچے کھڑا رہا اور انھوں نے کھایا۔ پس جب فرشتوں نے کھایا پیا تو تمام شہوانی باتیں جو تغذیہ کو لازم ہیں

پائی گئیں پھر قدوسیت ملائکہ کہاں باقی رہی؟

انبیائے کرامؑ کے متعلق لکھا ہے: ''کتاب پیدائش کے باب نو میں ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام شراب پی کر بدمست اور بدحواس ہوئے کہ تمام ستر برہنہ ہوگیا اور ان کے بیٹوں نے ڈھانکا۔''

کتاب پیدائش کے انیسویں باب میں ہے: ''حضرت لوط علیہ السلام نے شراب پی کر اپنی دونوں بیٹیوں سے زنا کیا اور یہ معاملہ دوبار وقوع میں آیا۔''

کتاب پیدائش میں ستائیسویں باب میں مذکور ہے: ''حضرت یعقوب علیہ السلام نے بکری کے بچوں کی کھال ہاتھوں پر لپیٹ کر جھوٹ بولا اور اپنے باپ اسحاق کو دھوکہ دینے کو اپنا نام عیص بتلایا۔''

کتاب پیدائش کے چونتیسویں باب میں مذکور ہے: ''حمور کے بیٹے سکم نے حضرت یعقوب کی بیٹی دینہ سے زنا کیا اور یعقوب کے بیٹوں نے اس سے یہ مکر کیا کہ تو اور تیری تمام قوم اگر ختنہ کرے تو دینہ کی شادی تجھ سے کردیں؛ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور ان نبی زادوں نے ایسا موقع پا کر اس کو اور اس کی تمام قوم بے گناہ کو نہایت بے رحمی سے تہ تیغ کیا اور مال واسباب لوٹ لیا اور ان کی بیویوں اور بچوں کو غلام بنایا؛ مگر حضرت یعقوب نے منع کرنا تو درکنار اس نالائق حرکت پر اپنی ناراضگی بھی ظاہر نہ کی۔'' (ایضاً، ۱۸۳-۱۸۴) غرض اس طرح کے اور بھی بہت سارے شواہد موجود ہیں جن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یقینی طور پر موجودہ تورات الہامی نہیں ہے۔ عصمت انبیاء اور قدوسیت ملائکہ کا مخدوش کرنا یا اسی طرح انبیائے کرام کی جانب دوسری غیر معمولی باتیں منسوب کرنے سے شک یقین میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

(۲) ایک دوسری داخلی وجہ مولانا حقانی نے اپنی تفسیر کے مقدمے میں یہ لکھی ہے۔

''ان کتابوں میں باہم ایسے مضامین متعارض پائے جاتے ہیں کہ جو الہامی کتابوں کی شان سے ازبس بعید ہیں اور مواضع متعارضہ میں سے ایک کا غلط ہونا بدیہی ہے۔ ان مواقع میں مفسرین اہل کتاب لاچار ہوکر یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ سہو کاتب ہے؛ چنانچہ ایسے سہو کاتب کہ جن کو ویریوس ریڈنگ کہتے ہیں خود پادری فنڈر نے مباحثہ دینی مطبوعہ اکبرآباد میں لاکھ سے بھی زیادہ تسلیم کیے ہیں؛ چنانچہ صفحہ پینتیس میں لکھتے ہیں کہ گریسباخ نے ایسے غلط مقامات ایک لاکھ پچاس ہزار گنے ہیں اور انسائیکلو پیڈیا برٹینکا کی جلد انیس میں بیان اسکریچر میں لکھا ہے کہ فاضل ویسٹین نے ایسے مقامات دس لاکھ سے زیادہ گنے ہیں۔ اب جب کہ ایسے بڑے محققین اقرار کرتے ہیں تو کسی آج کل کے کرسٹین یا نئے پادری کا انکار کیا وقعت رکھتا ہے؟'' (ایضاً، صفحہ ۱۸۴-۱۸۵)

(۳) ان کتابوں کا طرز طریق فحش آمیز اور نہایت غیر مہذب ہے جو روح کے تقاضے پورے کرنے سے بالکل عاری ہے؛ بلکہ قوائے شہوانیہ وخیالات شیطانیہ کے جلا دینے کے لیے ایک عمدہ نسخہ ہے، میں بطور نمونہ کسی قدر عبارتیں نقل کر کے دکھاتا ہوں۔ کتاب یسعیاہ کے بیالیسویں باب میں خدا کا کلام یہ ہے۔ میں بہت مدت چپ رہا میں خاموش ہو رہا آپ کو روکتا گیا پر اب میں اس عورت کی طرح جسے درد زہ ہو، چلاؤں گا اور زور زور سے ٹھنڈی سانس بھی لوں گا۔ اور نوحہ یرمیاہ کے باب تین میں خدا کو ریچھ اور شیر بتایا ہے۔ کتاب حزقیل کے تیئیس باب میں یہ ہے۔ خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا اور اس نے کہا اے آدم زاد! دو عورتیں تھیں جو ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئیں انھوں نے مصر میں زنا کاری کی وے اپنی جوانی میں یار باز ہوئیں وہاں ان کی چھاتیاں مل گئیں اور وہاں ان کے بکر کی پستان چھوئی گئیں ان میں کی بڑی کا نام اہولہ اور اس کی بہن اہولیبہ وے میری جوروا ں ہوئیں اور بیٹے بیٹیاں جنیں۔ معاذ اللہ مرد الہامی کو کیا بنی تھی کہ اس نے ایسی فاحش باتیں لکھ کر اپنی کتاب کو بے اعتبار کیا۔

کتاب یرمیاہ کے تیسرے باب میں ہے: ''کوئی مرد اگر اپنی جورو کو نکالے اور وہ وہاں سے جا کے دوسرے مرد کی ہو جائے، کیا وہ پہلا اس کے پاس پھر جائے گا؟ کیا وہ زمین ناپاک نہ ہوگی؛ لیکن تو نے بہت یاروں کے ساتھ زنا کیا تھا، تب بھی میری طرف پھرا۔'' (ایضاً، ۱۸۵)

یہ تمام مثالیں مولانا حقانی نے لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ موجودہ تورات تحریف شدہ ہے۔ اچھا حقیقت بھی یہی ہے کہ خدا کا کلام اس قدر فحش اور غیر مہذب باتوں پر مشتمل نہیں ہوسکتا ہے۔ خدا کے کلام میں پاکیزگی، حسن اور قدوسیت کا پایا جانا ضروری ہے۔ ورنہ پھر معاشرتی اور سماجی سطح پر اس کے اثرات ضرر رساں ثابت ہوں گے۔ برعکس اس کے سچ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب اور پیغمبر کے توسل سے معاشرے میں امن وامان، سلامتی اور پاکیزگی قائم کرتا ہے؛ لیکن تصور کیجیے کہ جب ذات باری تعالیٰ کے ہی کلام میں نعوذ باللہ فحش اور عریانیت ہو تو پھر معاشرے میں کیا مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔ لہٰذا عقل اور فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ جب موجودہ تورات میں اس طرح کی باتیں ہیں تو پھر واقعی وہ الہامی نہیں ہوسکتی؛ بلکہ خدا کے کلام میں تحریف لفظی ومعنوی دونوں کر دی ہیں۔

(۴) مولانا حقانی نے موجودہ تورات کے محرف ہونے میں یہ ثبوت بھی پیش کیا ہے کہ محققین اہل کتاب کا ان کتابوں کے مصنفوں کی بابت اور ان کے زمانۂ تالیف کی بابت سخت اختلاف ہے جس سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ محض تخمینی طور پر ان کتابوں کو اپنے انبیاء کی تصنیف بتلاتے ہیں، نہ کوئی ان کے

پاس مؤلفین تک سند متصل ہے، نہ کوئی اور دلیل قابلِ تسکین ہے؛ بلکہ صرف قیاس اور تخمین ہے۔

تورات کی نسبت سکندر گیدس کا قول انسائیکلو پیڈیا یا پینی کی دسویں جلد میں یوں منقول ہے کہ مجھ کو یقینی طور سے تین باتیں معلوم ہوئیں۔ (۱) یہ کہ تورات موجودہ ہرگز موسیٰ کی تصنیف نہیں۔ (۲) یہ کہ کسی شخص نے اس کو کنعان یا یروشلم میں موسیٰ کے بہت مدت بعد لکھا ہے۔ (۳) یہ کہ اس کی تالیف داؤد علیہ السلام کے زمانے سے پہلے کی نہیں ہے۔

کتاب یوشع کی نسبت بھی بڑا اختلاف ہے بعض لوگ تو اس کو یوشع کی تصنیف کہتے ہیں اور ڈاکٹر لائٹ فٹ اس کو فنیحاس کی کہتے ہیں: حالانکہ عزرا اور فنیحاس میں تخمیناً نوسو برس کا فاصلہ ہے۔ اس لیے یہود لاچار ہوکر اس کو صموئیل کی تصنیف بتلاتے ہیں۔ کتاب راعوث میں بھی شدید اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ حزقیا کی تصنیف ہے، اس تقدیر پر یہ الہامی نہیں ہے اور بعض کہتے کہ عزرا کی تصنیف ہے۔ یہود اور اکثر عیسائی صموئیل کی تصنیف کہتے ہیں اور کاتلک ہرلڈ کی ساتویں جلد کے صفحہ تین سو پانچ میں ہے کہ راعوث کی کتاب ایک گھر کا دکھڑا سا ہے اور یونس کی کتاب محض کہانی ہے یعنی دونوں غیر معتبر ہیں۔ کتاب نحمیاہ میں بھی اختلاف ہے۔ اکثر کہتے ہیں: نحمیاہ کی تصنیف ہے اور کریزاسٹم وغیرہ عزرا کی کہتے ہیں اس میں داراشاہ ایران کا بھی ذکر ہے۔ جو نحمیاہ کے سو برس بعد ہوا ہے؛ اس لیے لاچار ہوکر اس باب کو الحاقی کہتے ہیں۔ کتاب ایوب میں بھی نہایت اختلاف ہے۔ میکائلس اور سملر اور بشپ اسٹناک وغیرہم کہتے ہیں کہ ایوب ایک فرضی نام ہے اور یہ کتاب جھوٹی کہانی ہے اور جو ایوب کا وجود مانتے ہیں تو وہ اس کے زمانے میں اختلاف کرتے ہیں بعض ابراہیم علیہ السلام سے پہلے زمانہ کا بعض حضرت موسیٰ کے زمانے کا بعض قضاۃ کے عہد کا اور بعض یعقوب علیہ السلام کے زمانے کا اور بعض سلیمان علیہ السلام کے، بعض بخت نصر کے، بعض اردشیر شاہ ایران کے عہد کا بتلاتے ہیں اور اس کتاب کے مصنف میں بھی سخت اختلاف ہے کوئی الیہو، کوئی ایوب، کوئی موسیٰ، کوئی سلیمان کوئی اشعیا کوئی کسی نامعلوم شخص کو کہتا ہے کہ جو منسی بادشاہ کے عہد میں ہوا ہے اور حزقیل اور بعض عزرا کا نام لیتے ہیں۔ (ایضاً، صفحہ ۱۸۶-۱۸۷)

متذکرہ ثبوت اس بات پر بین دلیل ہیں کہ موجودہ تورات میں ترمیم وتبدیلی کا عمل کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی ہوگی کہ جس کتاب کا مصنف اور زمانۂ تالیف یقینی نہ ہو تو لامحالہ اس مسودے یا کتاب کی افادیت واہمیت اور معنویت میں خفت آجاتی ہے۔ مولانا حقانی نے جو ثبوت پیش کیا ہے اور جن وجوہات کی بنیاد پر موجودہ تورات کو محرف مانا ہے، وہ تمام دلائل قابل غور اور لائق اتباع ہیں۔

یہ آرار مولانا حقانی کی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی عیسائی یا یہودی مولانا کی یا اسی طرح کے دیگر مفکرین کی آرار کا رد کردے؛ لیکن انصاف اور علمی امانت کا تقاضا تو یہی ہے کہ اب موجودہ تورات تبدیل ہوچکی ہے۔ اس کے مضامین اور زبان و بیان کا جو اسلوب و انداز ہے وہ بہت حد تک تشویشناک ہے۔ کلام الٰہی میں نازیبا کلمات آنا یا انبیائے کرام کی جانب غیر یقینی باتیں منسوب کرنا صاف طور پر بتاتا ہے کہ تورات میں قطعی طور پر تحریف کی جاچکی ہے۔

انجیل کے متعلق مولانا حقانی کی رائے

بائبل کا دوسرا حصہ عہد نامۂ جدید (New testament) ہے جسے انجیل کہا جاتا ہے۔ اس کا ذکر قرآن وحدیث میں ملتا ہے، یعنی یہ کتاب عیسی علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ مولانا حقانی کی رائے ذکر کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عہد نامہ جدید کا تعارف پیش کردیا جائے۔

خالد محمود مدنی اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں لکھتے ہیں۔

''عہد نامۂ جدید ستائیس کتب پر مشتمل ہے۔ اس میں چار اناجیل، متی، مرقس، لوقا اور یوحنا، رسولوں کے اعمال، پولوس سے منسوب چودہ خطوط، عام خطوط آٹھ (Catholic letters) اور یوحنا عارف کا مکاشفہ (Revelation) شامل ہیں۔ نئے عہد نامے میں ستائیس کتابیں جنہیں ۱۶۰۰ سال پہلے کلیسائے جامع نے مستند قرار دیا تھا۔ یہ ستائیس کتابیں قدرتی طور پر چار حصوں میں تقسیم ہیں۔ (الف) چار اناجیلیں (ب) اعمال رسل (ج) اکیس خطوط جو رسولوں اور ان کے ساتھیوں نے لکھے (د) مکاشفہ کی کتاب۔ یہ ترتیب نہ صرف منطقی ہے؛ بلکہ جہاں تک نفس مضمون کا تعلق ہے قدرے تاریخی بھی ہے؛ لیکن ان کا سن تصنیف اس ترتیب کے مطابق نہیں ہے۔ نئے عہد نامے کی جو کتابیں سب سے پہلے لکھی گئیں وہ پولس رسول کے خطوط تھے ۴۸ اور ۶۰ کے درمیان لکھے گئے اس وقت تک اناجیل نہیں لکھی گئی تھیں۔ چاروں اناجیلیں ۶۰ء اور ۱۰۰ء کے درمیان لکھی گئیں۔ یہ وہی اجزار ہیں جن کو ۳۸۲ء کی کونسل نے تسلیم کیا اور پانچویں صدی کے خاتمے (۴۹۲-۴۹۶ء) پر پوپ گلاسیوس نے اس کی تصدیق کردی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی اصل زبان عبرانی یا آرامی تھی؛ مگر ان میں سے کوئی کتاب بھی اصل زبان میں موجود نہیں ہے۔ جہاں تک عہد نامۂ جدید کا تعلق ہے تو یہ صرف عیسائیوں کے نزدیک بائبل کا حصہ ہے۔ محققین کا اس بارے میں اتفاق ہے کہ اناجیل کا مواد زبانی روایات کی شکل میں تھا، ان سے اقوال مسیح (Logia) نے جنم لیا اور پھر انجیل کے ہر مصنف نے اپنے دینی مزاج اور منفرد انداز کے مطابق اس مواد کو ترتیب دیا اور متفرق مواد کو یکجا کیا۔ انجیل کے

مصنّفین نے کلیسا کے ارباب اختیار کی ضرورت کے مطابق مواد جمع کر کے ترتیب دیا'' (خالد محمود مدنی، برصغیر کا تفسیری ادب اور کتاب مقدس، صفحہ ۲۸)

اس تعارف سے انجیل کے مشمولات اور اس سے متعلق ضروری باتیں ذہن نشین ہوگئی ہوں گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو انجیل اس وقت موجود ہے یہ وہی ہے جس کا ذکر اسلامی نصوص میں ملتا ہے۔ یا موجودہ انجیل تحریف وترمیم کا شکار ہوچکی ہے۔ مولانا حقانی کی رائے یہ ہے کہ اصل انجیل تو موجود نہیں ہے؛ البتہ اس کی تحریف شدہ شکل موجود ہے۔ اس حوالے سے مولانا حقانی نے اپنی تفسیر میں کئی اہم دلائل اور وجوہات نقل کی ہیں ذیل میں ان کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مولانا رقم طراز ہیں:

جن کو عیسائی انجیل کہتے ہیں، میں کسی قدر انھیں کا حال بیان کرتا ہوں۔ انجیل متی، انجیل لوقا، انجیل مرقس، انجیل یوحنا، حواریوں کے اعمال یعنی تاریخ پولس کے خطوط، یعقوب کا خط وغیرہ، ان اناجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات اقوال وافعال مندرج ہیں۔ طرز تحریر کہہ رہا ہے کہ آنکھوں دیکھے یا سنے سنائے حالات لکھتے ہیں، نہ الہام کا دعویٰ ہے نہ الہامی طور ہے نہ الہام کی حاجت۔ ان کتابوں میں واقعات کی نسبت کمی زیادتی بھی ہے اور مخالفت بھی پائی جاتی ہے۔ ان کتابوں کو عیسائی منزل من اللہ جانتے ہیں؛ مگر لطف یہ ہے کہ نہ ان کے مصنفوں کی نبوت ثابت ہے، نہ کوئی معجزہ ان سے سرزد ہونا ثابت ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ تعجب ہے کہ لوقا اور مرقس حواری نہیں اور متی و یوحنا جو حواری ہیں تو حواریوں میں بڑے رتبے کے نہیں، ان سے بڑے بڑے مقرب حواری شمعون پطرس وغیرہ تھے، ان کی کوئی انجیل نہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ تخمیناً ایک سو تیس اور کتابیں ہیں کہ جن میں عیسائیوں کے یہاں اختلاف ہے یا یوں کہو کہ اختلاف تھا، قدماء نے ان میں بعض کو الہامی اور بعض کو غیر الہامی مانا اور متاخرین نے اس میں اختلاف کیا اور بعض کتابوں کو الہامی تو نہیں؛ مگر جس طرح اہلِ اسلام حدیث کی کتابوں کو مانتے ہیں، وہ بھی ان کو اسی مرتبہ میں سمجھتے ہیں، انھیں میں سے برنباس حواری کی انجیل ہے۔

انجیل متی: متی نے انجیل عبرانی زبان میں لکھی تھی، لارڈ نر نے اپنی کتاب (مطبوعہ ۱۸۲۷ء بمقام لندن) کے صفحہ پانچ سو چوہتر جلد دوم میں ارجن کے تین قول نقل کیے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی انجیل عبرانی میں تھی۔ اور اسی طرح یوسی بیس اور جروم وغیرہ عیسائیوں کے بڑے بڑے عالم اس کے قائل ہیں اور ہارن مفسر نے اپنی تفسیر کی جلد چہارم میں ان کے اقوال نقل کیے ہیں اور یہ بھی لکھا

ہے کہ اس کی تصنیف ۳۷ء یا ۳۸ء میں ملک یہودیہ میں ہوئی اور ۶۱ء میں پھر اس کا عبرانی سے یونانی زبان میں ترجمہ ہوا؛ مگر تحقیق یہی ہے کہ متی نے نہیں؛ بلکہ کسی اور شخص نے اس کا ترجمہ کیا۔ پادری فنڈر ''اختتام دینی مباحثہ'' مطبوعہ سکندرہ اکبر آباد ۱۸۵۵ء کے صفحہ ۳۷ میں کہتا ہے کہ ''حواریوں کے کسی مرید نے اس کا ترجمہ یونانی میں کیا ہے'' اصل عبرانی انجیل متی کا اب کیا صدیوں سے دنیا میں نشان نہیں۔ کسی کلیسا میں نہیں اور اس کے مفقود ہونے پر تمام عیسائی متفق ہیں، اب اس کے مفقود ہونے کی جو وجہ خیال میں آئے وہی اصل انجیل کو سمجھ لینی چاہیے۔ اب رہا ترجمہ یونانی اول تو مترجم کا حال یقینی طور پر معلوم نہیں کہ وہ کس لیاقت اور کس دیانت کا آدمی تھا؟ پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ دراصل یہ اس کتاب عبرانی کا ترجمہ ہے یا کوئی اور نئی کتاب ہے؟ اور پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ ترجمہ صحیح ہے یا غلط اور غلط ہے تو کس قدر؟ کیوں کہ یہ باتیں اصل سے مطابقت کیے بغیر معلوم ہو نہیں سکتیں اور اصل کا دنیا میں نشان بھی باقی نہیں۔ اس انجیل یونانی کے اول اور دوسرے باب کو عیسائیوں کے محقق ڈاکٹر ولیمس وغیرہ اور نیز عیسائیوں کا ایک فریق جس کو یونی ٹیرین کہتے ہیں الحاقی اور جعلی کہتے ہیں۔ خصوصاً باب اول میں جو نسب نامہ ہے مسیح علیہ السلام کا اس میں تو ایسی فاحش غلطیاں ہیں جن کی بابت مفسرین انجیل کو کوئی جواب بھی بن نہیں پڑتا؛ مگر عیسائی اس کو بھی الہامی مانتے ہیں۔

انجیل مرقس: مرقس کا اب تک صحیح حال بھی عیسائیوں کو معلوم نہیں کہ وہ کس ملک میں پیدا ہوا اور کس برس میں عیسائی ہوا، صرف اتنی بات کہتے ہیں کہ وہ پطرس حواری کا شاگرد ہے اور اس نے پطرس وغیرہ لوگوں سے سن کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات لکھے اور اس کتاب کا سن تالیف بھی بخوبی معلوم نہیں۔

پادری اسکاٹ دیباچہ تفسیر رومن ۲۳۹-۲۴۰ میں کہتا ہے ''ٹھیک معلوم نہیں کہ کس وقت یہ صحیفہ لکھا گیا؛ مگر گمان غالب ہے کہ اس کی تصنیف ۵۶ء اور ۶۳ء کے درمیان ہوئی اور بالاتفاق شہر روم میں اس نے یہ کتاب تصنیف کی اور رومیوں کے لیے لکھی'' تو لاطینی یعنی رومی زبان میں لکھی گئی کس لیے کہ رومی لوگوں کی زبان لاطینی ہے، مگر اصل نسخے کا اب تک پتہ نہیں، ہاں اس کا ترجمہ یونانی موجود ہے۔ اول تو مرقس کی نبوت ثابت نہیں پھر الہام تو درکنار۔ دوم پطرس اور پولس اس کے راوی ہیں؛ لیکن وہ اپنے شیوخ کا ذکر تک نہیں کرتا اور یہ بات پوری شبہ پیدا کرنے والی ہے۔ سوم اصل کتاب مفقود ہے ترجمہ میں کلام ہے۔

انجیل لوقا: یہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے نہیں؛ بلکہ پولس کا شاگرد ہے، نہ

اس شخص کا پورا حال دریافت ہوا کہ کہاں کا باشندہ تھا اور کس کے ہاتھ پر دین میں داخل ہوا۔ اور اس کی اصل زبان کیا تھی اور یہ انجیل اس نے کب لکھی اور کس زبان میں لکھی اور جب کہ متی اور مرقس کی انجیل تصنیف ہو چکی تھی تو پھر انھیں باتوں کے قلم بند کرنے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ کیا وہ اس کے نزدیک پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی تھی؟ اس کا سن تالیف قیاسی طور پر ۶۴ء بیان ہوا ہے۔ یہ کہیں نہیں کہتا کہ میں رسول ہوں اور میں جو کچھ لکھتا ہوں الہام سے لکھتا ہوں۔ اس کی روایت بھی مقطوع ہے؛ کیوں کہ یہ اپنے شیوخ کا ذکر تک بھی نہیں کرتا۔

انجیل یوحنا: یہ یوحنا حواری کی طرف منسوب ہے، اس کی تالیف کا زمانہ بھی تخمینی ہے یعنی تخمیناً سویں عیسوی میں یعنی عروج مسیح سے ستر برس بعد؛ مگر یہ بھی الہام اور رسول ہونے کا مدعی نہیں۔ اس کے طرز بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ مبالغہ بھی اس کے کلام میں ہے؛ چنانچہ اسی انجیل کے اکیس باب پچیسویں ورس میں یہ ہے کہ ''مسیح کے حالات میں کتابیں جو لکھی جاتیں تو دنیا میں نہ سماتیں'' ہرگز یہ صحیح نہیں کس لیے کہ اگر کوئی حضرت مسیح کا روز تولد سے آخر تک روزنامہ بھی لکھتا اور فرض کرلو کہ ایک روز کے حالات ایک کتاب میں درج ہوتے تو بھی وہ سب کتابیں یروشلم میں سما سکتی تھیں دنیا تو بڑی وسیع ہے۔ اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ دوسری صدی میں لوگوں نے انجیل یوحنا کی بابت کلام کیا کہ یہ ان کی تصنیف نہیں۔ اس وقت آرنیوس موجود تھا اور یہ پولی کارب کا شاگرد تھا اور پولی کارب یوحنا حواری کا؛ مگر آرنیوس نے اپنے دادا استاد کی کتاب پر شہادت نہ دی، معلوم ہوا کہ اس کو بھی شک تھا یا اس کے استاد نے ذکر بھی نہیں کیا تھا، وگرنہ ایسے موقع پر سکوت کرنا کوئی وجہ نہیں رکھتا، اس کے علاوہ کا تلک ہرلڈ کی چوتھی جلد مطبوعہ ۱۸۳۳ء صفحہ ۲۰۵ میں یہ ہے۔ استاڈلن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ''انجیل یوحنا مدرسہ اسکندریہ کے کسی طالب علم کی تصنیف ہے اس میں کوئی بھی شبہ نہیں'' اور اسی طرح محقق برتیشنیڈر کہتا ہے کہ ''یوحنا کی تصنیف سے نہ یہ انجیل ہے نہ اور رسائل بلکہ دوسری صدی عیسوی میں کسی اور شخص نے تصنیف کر کے ان کے نام کر دیے کہ لوگوں میں اعتبار ہو'' (تفسیر حقانی، جلد چہارم، صفحہ ۷۵-۷۶)

مولانا حقانی یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب چاروں انجیلوں کا یہ حال ہے تو پولوس کے خطوط کا کیا اعتبار ہے، اس میں تثلیث اور خدا کا مجسم ہونا اور شریعت کو ترک کرنا وغیرہ وہ ملحدانہ مضامین ہیں کہ جو تمام اہل نقل وعقل کے نزدیک بدتر اور خراب ہیں اور پطرس اور دیگر شخصوں کے خطوط بھی ان شرائط سے خالی ہیں کہ جو کتاب الٰہی کے لیے ضروری ہیں۔ (تفسیر حقانی، جلد ایک، صفحہ ۱۹۵)

مذکورہ تمام تفصیل سے یہ اندازہ ہوگیا کہ مولانا حقانی کے یہاں انجیل کے نام سے اس وقت جو عیسائیوں کی دینی کتاب پائی جاتی ہے وہ اب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں ہے۔اس تفصیل کے علاوہ بھی مولانا حقانی نے کئی اہم وجوہات انجیل کے مفقود ہونے کی پیش کی ہیں، ان تمام کو یہاں طوالت کے باعث ترک کیا جاتا ہے۔

زبور: مولانا حقانی زبور کے متعلق رقم طراز ہیں:

''ارجن اور اگسٹائن وغیرہ کل زبور کو داؤد علیہ السلام کی تصنیف کہتے ہیں اور جیروم اور بوتھی میس وغیرہ علماء اس قول کو رد کرتے ہیں اور تیس زبور سے زیادہ کے مصنف کو نامعلوم شخص کہتے ہیں۔ باقی نوے سے ننا وے تک کو حضرت موسیٰ کی تصنیف اور اکہتر زبور کو داؤد کی اور بارہ کو اساف کی اور گیارہ زبور کو قورح کے تین بیٹوں کی کہتے ہیں اور اٹھاسیواں زبور ہمان کی اور نواسیواں اتھان اور تین زبور جدوتھن کی تصنیف کہتے ہیں اور ایک سو ستتر واں سلیمان کی تصنیف کہتے ہیں۔امثال سلیمان میں بھی نہایت اختلاف ہے الغرض یہ اختلاف سلف سے خلف تک چلا آیا ہے کہ جس کو لاچار ہوکر صاحب وکیل مذہب پولوسی نے بھی ''میزان الحق'' میں قبول کرلیا ہے۔(تفسیر حقانی، جلد ایک صفحہ ۱۸۷)

مولانا حقانی ان تمام اہم اور ضروری چیزوں کے نقل کرنے کے بعد ان وجوہات کا بھی ذکر کرتے ہیں جن کی وجہ سے ان کتابوں کو اب منزل من اللہ نہیں کہا جاسکتا ہے۔

(۱) تورات وہ کتاب ہے جو خاص حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی اور زبور وہ کتاب ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام کو عطا ہوئی تھی اور انجیل وہ کتاب ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی اور کچھ اور صحیفے حضرت ابراہیم علیہ السلام وغیرہ انبیاء پر نازل ہوئے تھے۔اور اس امر منصوص میں سنی شیعہ کل فرقے اسلام کے سلف سے خلف تک متفق ہیں پس یہ کتاب جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد میں تصنیف ہوئی اور کچھ مضامین تورات اصلی کے یادداشت کے طور پر اس میں درج کرکے تورات نام رکھا گیا قطعی وہ تورات نہیں جس کا قرآن میں ذکر ہے۔اسی طرح وہ کتابیں جو حضرت عیسیٰ علیہ کے بعد لوگوں نے تصنیف کی ہیں اور ان میں حضرت عیسیٰ کے حالات واقوال کو صحیح وغلط طور پر جمع کردیا ہے کہ جس کو اب عیسائی انجیل متی ومرقس ولوقا ویوحنا کہتے ہیں وہ انجیل نہیں کہ جس کا ذکر قرآن میں ہے۔(ایضاً، ۱۹۵-۱۹۶)

(۲) تورات، زبور اور انجیل ودیگر صحف انبیاء کہ جن کا قرآن میں ذکر ہے کلام الٰہی اور واجب التعظیم تھے جو کچھ خدا تعالیٰ نے انبیاء کی معرفت ان میں ذکر فرمایا تھا سب حق تھا۔اسلام کی بڑی خوبی

یہ ہے کہ اس نے ہدایت کی کہ اپنا اور بیگانہ کچھ نہ دیکھو؛ بلکہ جس قدر خدا کے فرستادہ لوگ ہیں کہ جن کو انبیاء کہتے ہیں خواہ کسی ملک کے ہوں اور جس قدر مقدس کتابیں خدا نے بھیجی ہیں سب پر ایمان لاؤ اگر چہ بحکم وَاِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْر (ہر گروہ میں خدا تعالیٰ کی طرف کا ہادی آیا ہے) وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ۔ ہر قوم اور ہر ملک خدا تعالیٰ کے ہادی نبی یا ان کے نائب ضرور آئے ہیں (کہ جن کا تفصیلی علم خدا ہی کو ہے اور اجمالاً ہم سب کو حق جانتے ہیں)؛ مگر چونکہ ان انبیاء کے طرق اور کتب میں حوادثِ زمانہ سے وہ تغیرات پیش آئے اور وہ تحریفات اور خلط ہوا کہ جس سے اصل مذہب کے مشائخ نے اپنے خیالات فاسدہ کو مضامین الٰہیہ میں ملا کر ایک ایسا معجون مرکب بنایا کہ جس کے اجزاء اصلیہ اور غیر اصلیہ میں تمیز کرنا کسی استحالہ کیمیا سے ممکن نہ رہا؛ اس لیے خدا تعالیٰ نے اپنی کمال رحمت سے نبیوں کے اخیر ایک ایسا نبی بھیجا کہ جس کی تعلیم کامل کی وجہ سے آئندہ کسی نبی کی ضرورت نہ رہی اور اس پر وہ کتاب جامع نازل فرمائی کہ جس میں پہلے انبیاء کی ضروری ہدایتیں اور ان کتب مقدسہ کے سب اصول زمانۂ اخیر کی رعایت کا لحاظ رکھ کر جمع کر دیے اور ہم کو اس تکلیف مالا یُطاق سے نجات بخشی کہ کتابوں کی تحقیق کرتے پھریں اور ان کے وجود اصلی میں سرگردانی اٹھاویں اور جو کوئی نسخہ بہم پہنچے تو پھر اس میں اصل اور ملونی میں تمیز کریں! للہ الحمد۔ (ایضاً، صفحہ ۱۹۶)

(باقی آئندہ)

نماز میں خشوع وخضوع کی اہمیت

از: مولانا محمد راشد شفیع

ارکان اسلام میں کلمۂ طیبہ کے بعد سب سے اہم رکن نماز ہے، اللہ تبارک وتعالی نے قرآن کریم میں جابجا اقامتِ نماز کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور اقامت کا مطلب یہ ہے کہ نماز کو تمام شرائط کی رعایت کرتے ہوئے حسن وخوبی اور کامل طریقے سے ادا کرنا، اور نماز کا ظاہری اور باطنی حسن اس میں ہے کہ نماز کو خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کیا جائے، اور یہی درحقیقت نماز کو کامل طریقے سے ادا کرنا ہے، وریہی مقام احسان ہے جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالی کی عبادت ایسی کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اگر یہ نہ ہو سکے تو یہ یقین رکھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے (بخاری، ج1)۔

خضوع کے معنی ہیں دب جانا، عاجزی سے اپنے آپ کو جھکا دینا، قلبی خوف اور تواضع کی وجہ سے نگاہ کو پست رکھنا، اور بدن میں تواضع اور انکساری کا پیدا کرنا۔

نماز میں خشوع اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ صرف جسم کا ظاہر نہیں؛ بلکہ باطن بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پوری طرح یکسو رہے، یعنی ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اسے نماز اس طرح پڑھنی چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالی کا خوف اور اللہ تعالی کی عظمت پیشِ نظر ہو اور اس انسان کا دل دنیا سے بالکل غافل ہو اور دل نماز میں لگا ہوا ہو اور ظاہری اعضاء میں بھی سکون اور اطمینان ہو اور کوئی عبث اور بیکار کام نہ کرے جس سے دل خیالات کی طرف جائے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے سلف صالحین نماز اس طریقے سے ادا فرمایا کرتے تھے گویا کہ یہ ان کی آخری نماز ہے اور نماز کی حالت میں ان کے دل دنیا سے غافل ہوا کرتے تھے اور انھیں یہ معلوم نہیں ہوا کرتا تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے؟ اور ظاہری اور باطنی اعتبار سے یکسو ہو کر نماز پڑھا کرتے تھے، قرآن کریم اور احادیثِ مبارکہ میں

نماز کوخشوع وخضوع اور اطمینان وسکون کے ساتھ ادا کرنے کی بار بار تعلیم دی گئی ہے؛ چنانچہ سورہ بقرہ میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

صبر اور نماز کے ذریعہ مدد حاصل کیا کرو۔ بیشک وہ نماز بہت دشوار ہے؛ مگر جن کے دلوں میں خشوع ہے ان پر کچھ بھی دشوار نہیں (البقرہ) دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

'' تمام نمازوں کی خاص طور پر درمیان والی نماز (یعنی عصر کی) پابندی کیا کرو اور اللہ کے سامنے باادب کھڑے رہا کرو'' (البقرہ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے۔ ایک اور صاحب بھی مسجد میں آئے اور نماز پڑھی، پھر نماز کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا آپ علیہ السلام نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: جاؤ نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی، وہ گئے اور جیسے نماز پہلے پڑھی تھی ویسے ہی پڑھ آئے، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آکر سلام کیا تو آپ نے فرمایا: جاؤ نماز پڑھو؛ کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی، اس طرح تین مرتبہ ہوا، اس شخص نے عرض کیا: اُس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں اس سے اچھی نماز نہیں پڑھ سکتا، آپ مجھے نماز سکھایئے۔ آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو تکبیر کہو، پھر قرآن مجید میں سے جو کچھ پڑھ سکتے ہو پڑھو، پھر رکوع میں جاؤ تو اطمینان سے رکوع کرو، پھر رکوع سے کھڑے ہو تو اطمینان سے کھڑے ہو، پھر سجدہ میں جاؤ تو اطمینان سے سجدہ کرو، پھر سجدہ سے اٹھو تو اطمینان سے بیٹھو۔ یہ سب کام اپنی پوری نماز میں کرو (صحیح بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

بدترین چوری کرنے والا شخص وہ ہے جو نماز میں سے چوری کرے۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! نماز میں کس طرح چوری کرے گا؟ آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: اس کا رکوع اور سجدہ اچھی طرح سے ادا نہ کرنا (گویا خشوع وخضوع کے بغیر نماز ادا کرنے کو) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدترین چوری قرار دیا (المستدرک للحاکم کتاب التفسیر، باب شرح معنی الخشوع)

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا فرماتی ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے اور ہم آپ سے گفتگو کر رہے ہوتے؛ لیکن جب نماز کا وقت ہوتا تو ہم ایسے ہو جاتے کہ گویا ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے (یہ اللہ تبارک وتعالی کے خوف اور عظمت کی وجہ سے تھا) (المعجم الکبیر)

یہی کیفیت نماز میں حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور سلف صالحین کی ہوا کرتی تھی کہ وہ نماز میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کو سامنے رکھ کر نماز ادا فرمایا کرتے تھے، اور ظاہری اور باطنی اعتبار سے سکون اور اطمینان سے نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔

حضرت سیدنا حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ سے ان کی نماز کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا جب نماز کا وقت آجاتا ہے تو میں پورا وضو کرتا ہوں پھر نماز کی جگہ آکر بیٹھ جاتا ہوں، یہاں تک کہ میرے تمام اعضاء پرسکون ہو جاتے ہیں پھر نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں اور کعبہ معظّمہ کو ابروؤں کے سامنے پل صراط کو قدموں کے نیچے جنت کو سیدھے ہاتھ کی طرف اور جہنم کو بائیں ہاتھ کی طرف ملک الموت کو اپنے پیچھے خیال کرتا ہوں اور نماز کو اپنی آخری نماز تصور کرتا ہوں پھر امید اور خوف کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ حقیقتاً تکبیر تحریمہ کہتا ہوں قرآن کریم ٹھہر ٹھہر کر پڑھتا ہوں، رکوع تواضع یعنی عاجزی کے ساتھ اور سجدہ خشوع کے ساتھ کرتا ہوں بایاں پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھتا ہوں دایاں پاؤں کھڑا کرتا ہوں، خوب اخلاص سے کام لینے کے باوجود یہی خوف رکھتا ہوں کہ نہ جانے میری نماز قبول ہوگی یا نہیں۔ (احیاء العلوم)

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے!

* * *

ضروری اطلاع

غیر ملک کے لیے حسب سابق ''ماہنامہ دارالعلوم'' کی روانگی شروع کردی گئی ہے۔ ضرورت مند حضرات ''دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند'' سے رابطہ کرسکتے ہیں۔

(۲) پاکستانی خریدار حضرات ''ماہنامہ دارالعلوم'' جاری کرانے کے لیے درج ذیل پتے پر رابطہ کرسکتے ہیں:

مولانا سیّد رشید میاں صاحب ناظم جامعہ مدنیہ راوی روڈ کریم پارک، لاہور پاکستان

(ادارہ)

مولانا عبدالصمد رحمانی: حیات وکارنامے

(۲/۱)

از: مولانا غالب شمس قاسمی

کچھ شخصیتیں لازوال ہوتی ہیں، وہ تاریخ کے صفحات میں گم نہیں ہوا کرتیں، ان کے کارنامے زندہ ہوتے ہیں، وہ لاکھوں تشنگانِ علوم کی علمی سیرابی کا ذریعہ ہوتی ہیں، ایسی ہی منفرد شخصیت مولانا عبدالصمد رحمانی کی تھی، وہ ایک وسیع النظر فقیہ، عظیم المرتبت محقق، عہدوں سے بیزار، قوم کے محسن، متعدد علمی تصانیف کے مصنف، معقولات کے امام، احقاق حق، ابطال باطل جن کا شیوہ، خانقاہ رحمانیاور امارت شرعیہ کی ترقی میں جن کا لہو شامل ہے، امارت شرعیہ ان کی خدمات اور کارناموں کی گواہ ہے، ان کی علمی، فکری جولانی کا مرکز ہے، جن کی دریافت میں علم وتحقیق اور فقہ وقضا کے بہت سے اہم مضامین شامل ہیں، جن کی کتابوں میں اجتہادی شان اور تفہیمی بلند پروازی ہے، فکر ونظر کے نئے اکتشافات اور قرآنی ترجمانی ہوتی ہے، جس نے ابوالمحاسن محمد سجاد کے نظریۂ امارت کو نئی وسعتوں سے ہم کنار کیا، جن کی ''قرآن محکم'' اجتہادی اور ولی اللہی فکر کی تکمیل ہے، جو حضرت ابوالمحاسن محمد سجاد اور ابوالکلام آزاد کے خواب کی حسین تعبیر اور ان کی آرزؤں کی تشریح تھے، جو اسم بامسمی باطل کے خلاف آہنی تلوار تھے، جن کی پوری عمر بے نیازی سے گزری، جن کا وطیرہ تھا ''گوشے میں قفس کے آرام بہت ہے۔'' جو امارت کے احاطے میں نائب صاحب، اور ناظم صاحب سے جانے جاتے تھے اور قوم کے درمیان مغتنم العلماء بقیۃ السلف حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔

آپ امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے دوسرے نائب امیر شریعت، امارت کے ناظم اور مفتی، قطب عالم حضرت مولانا محمد علی مونگیری کے مسترشد، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کے شاگرد رشید، اور ان کی زندگی بھر کے رفیق تھے، آپ جمعیۃ علماء ہند کے نائب ناظم اور مسلم انڈپنڈنٹ پارٹی کے

نگرانِ عام اور دارالعلوم دیوبند کے رکنِ شوریٰ تھے، آپ کو قرآن وحدیث سے بے حد شغف، امارت شرعیہ سے فکری وجذباتی وابستگی، اس سے والہانہ عشق اور تہذیبی وسیاسی تاریخ سے غیر معمولی لگاؤ تھا، علامہ سید سلیمان ندوی کی زبان میں ''فقہی مسائل میں بصیرت رکھتے ہیں، اور تفقہ فی الدین کی دولت خداداد سے بھی سرفراز ہیں''، (ہندوستان اور مسئلہ امارت) آپ نے علمی تحقیق اور اسلامی علوم میں کارہائے نمایاں انجام دیے، علمی تحریکات کے ذریعہ ملتِ اسلامیہ کی گراں قدر خدمات انجام دیں اور اکابر علماء کے ہمراہ آزادی ہند کی جنگ میں شریک رہے۔ بقول شاہد رام نگری: ''آپ کی زندگی علم اور سیاست کا ایک شاندار مرقع تھی اور آپ کی شخصیت جامع کمالات تھی۔'' (نقیب 17 ربیع الثانی 1393ھ مطابق۔ 21 مئی 1973ء)

سیرت کی پختگی، کردار کی استقامت، علم وفضل کی وسعت، جمعیۃ علماء ہند، مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی جیسی بڑی تنظیموں سے انسلاک وارتباط کی بنا پر آپ کی خدمات حد درجہ متنوع ہیں، آپ کی شخصیت نادر روزگار تھی، آپ کی کتابیں دراصل امارت کی روح ہیں، افکار ابوالمحاسن محمد سجاد کی آئینہ دار ہیں، آپ کی کتابیں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اپنی ذات میں انجمن تھے، قادیانیت اور آریہ سماج کے رد میں لکھی گئی آپ کی کتابیں علمی وتحقیقی شاہکار ہیں، علمی گہرائی وگیرائی، اور وسعت فکر ونظر کا اندازہ لگانا ہو تو مولانا کے تحقیقی، تصنیفی اور علمی کارناموں کو پڑھیے، تنہا آپ بے حساب علمی شخصیات کے برابر کام کر گئے اور آپ اپنی انہیں کتابوں اور تحریروں کے ذریعے آج بھی زندہ وتابندہ ہیں، آپ کے بارے میں حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند کی بات حرف بہ حرف سچی ہے کہ: حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی نائب امیر شریعت بہار، ورکن مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، مولانا ممدوح کا علمی فضل وکمال، عالمانہ رخ، اور انتھک علمی خدمات علمی حلقوں میں مسلم ہے، ان کے تعارف کے لیے خود انہی کی علمی شہادتیں کافی ہیں، جو انہیں علمی ذہنوں میں متعارف بناتی رہی ہیں، اور بناتی رہیں گی، کسی بیرونی قلم کو کبھی بھی اس تکلیف وتکلف کی ضرورت نہ ہوگی کہ وہ ان کے تعارف کے لیے کاغذ پر سرنگوں ہو۔ (قرآن محکم ص 1)

یہی وجہ ہے کہ ماہ وسال کے تھپیڑوں اور تاریخ کی بے رحمانہ بے التفاتی کے باوجود آپ کی شخصیت اب بھی علمی حلقوں میں جگمگا رہی ہے، اور اپنا فیض پہنچا رہی ہے۔

المیہ یہ ہے کہ ایسی نابغہ روزگار شخصیت، ہندوستان گیر شہرت یافتہ فقیہ ومحقق اور قوم کے محسن ومربی کی وفات پر پانچ دہائی گذرنے کے بعد بھی ان کی سوانح حیات وعلمی خدمات کے جائزے پر

اب تک مستقل کتاب نہ آسکی، یہ حق تو امارت شرعیہ وخانقاہ رحمانی کا ہے کہ ان کی زندگی پر سیمینار کرائے اور کماحقہ ان کو خراجِ عقیدت پیش کرے، میری نظر میں یہ فرض بھی ہے، اور قرض بھی، جس کی ادائیگی ابھی باقی ہے۔

شہر باڑھ

گنگا کے جنوبی کنارے پر واقع قصبہ باڑھ تاریخی اہمیت کا حامل رہا ہے، مغل اور برطانوی دور میں باڑھ پٹنہ کا ایک بڑا تجارتی شہر تھا، اور یہ پٹنہ وکولکاتا کے درمیان تجارتی مرکز اور گزرگاہ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا، اسی شہر میں محمد علی وردی خان نے مراٹھوں کو شکست دی، سکندر لودی نے بنگال کی طرف پیش قدمی کی، اور معاہدہ میں طے ہوا کہ باڑھ کا مشرقی علاقہ بنگال کے حکمران کے زیر نگیں ہوگا؛ جب کہ مغرب کا علاقہ دہلی سلطنت کے زیر تسلط ہوگا۔

یہ پٹنہ شہر سے ستر کلومیٹر کے فاصلے پر اور بیگوسرائے سے متصل واقع ہے، اسی شہر باڑھ سے ساڑھے چار کلومیٹر دور ایک چھوٹی سی بستی ہے بازید پور، (جو پہلے ایک مضافاتی قریہ تھا، اب گاؤں ہے) اسی گاؤں میں ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے شیخ سخاوت حسین، مولانا عبدالصمد رحمانی انہیں کے صاحب زادے تھے۔

حلیہ: طویل قد وقامت، گندمی رنگ، چھریرا بدن، آنکھیں چھوٹی، داڑھی اور سر کے بال گھنے، رعب دار خوبصورت، توانا چہرہ، چھوٹی آنکھیں، گال دھنسی ہوئی، آہستہ گفتگو فرماتے، اور معمولی کپڑے زیب تن کرتے۔

ولادت: آپ کی ولادت بازید پور قصبہ باڑھ ضلع پٹنہ میں ایک معزز گھرانے میں ہوئی، (نقیب 21 مئی 1973ء ص 16) یہی آپ کا آبائی وطن ہے، شادی کے بعد یہاں سے مانڈر ضلع مونگیر (موجودہ ضلع کھگڑیا) میں بس گئے، شاہد رام نگری نے ہفت روزہ نقیب امارت شرعیہ (17 ربیع الثانی 1393ھ مطابق 21 مئی 1973ء) میں آپ کی سن ولادت 1300 فصلی لکھی ہے، اس کے مطابق 1890 عیسوی اور 1308 ہجری سنہ پیدائش ہوا، حضرت مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ''مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے'' اور ''امارت شرعیہ: دینی جد وجہد کا روشن باب'' میں یہی تاریخ پیدائش لکھی ہے؛ لیکن مفتی صاحب نے ''قرآن محکم'' میں لکھا ہے کہ آپ کی سن پیدائش 1307 فصلی ہے۔ جو عیسوی اور ہجری کلینڈر کے لحاظ سے 1897ء مطابق 1315 ھجری ہوگا۔ یہ والی تاریخ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ خود مفتی صاحب کی دیگر دو کتابوں میں 1300

فصلی درج ہے اور قرین قیاس بھی یہی ہے کہ پہلی بات راجح ہے۔

یتیمی

آپ کی عمر پانچ سال کی ہوئی، تو آپ کے والد محترم شیخ سخاوت حسین کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا، (قرآن محکم۔ص 8) آپ کی والدہ محترمہ بی بی صغریٰ نے پرورش و پرداخت کی، آپ کی تعلیم کا عمدہ انتظام کیا، اور انہیں کی توجہات اور دعاؤں نے وہ تاثیر دکھائی کہ آپ دین کے خادم اور امارت کے نائب امیر بن گئے۔

ابتدائی تعلیم

آپ کی تعلیم کا آغاز گھر پر ہوا، بغدادی قاعدہ اور ناظرۂ قرآن گھر پر ہی پڑھا، آپ حافظ نہیں تھے، تھوڑے بڑے ہوئے، تو آپ روز اپنے گھر بازید پور سے قصبہ باڑھ تک پڑھنے کے لیے مولانا حکیم محمد صدیق صاحب کے پاس جاتے، عربی کی ابتدائی کتابیں ہدایہ النحو تک حضرت مولانا حکیم محمد صدیق صاحب سے پڑھی، حکیم صاحب قصبہ باڑھ میں مطب چلاتے تھے۔ (حیات سجاد ص 27)

کانپور کا سفر

ہدایۃ النحو کا سال 1909ء مطابق 1327ھ تھا، اسی سال درمیان میں تنہا گھر سے نکلے، کانپور کا ٹکٹ لے کر جامع العلوم کانپور پہنچ گئے اور یہاں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا؛ لیکن اجنبیت نے ستانا شروع کیا؛ چوں کہ بہاری طلبار کم تھے؛ اس لیے آپ کا دل نہ لگا۔ (حیات سجاد، ص 27، ہمارے امیر ص 42)

الہ آباد کا سفر

قدرت کی جانب سے دل میں الہ آباد کا القار ہوا؛ چنانچہ کانپور سے الہ آباد کا رخ کیا، اور مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں وسط سال میں پہنچ گئے، جہاں اس وقت حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی تدریس کے سلسلے میں بڑی شہرت تھی، حضرت ابوالمحاسن نے امتحان لے کر مدرسہ سے باہر ان کی تعلیم کا نظم فرمادیا، کافیہ تک پڑھنے کے بعد شرح جامی سے مولانا کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے، (حیات سجاد 28) حضرت ابوالمحاسن محمد سجاد امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے بانی اور جمعیۃ علمار ہند کے بانیین میں سے تھے (تفصیل کے لیے دیکھیں حیات ابوالمحاسن، امارت شرعیہ: دینی جدوجہد کا روشن باب) مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کا سیاسی کارنامہ اور خدمات میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی تائید، مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کا قیام، انجمن علمار بہار، اور جمعیۃ علمار بہار کا قیام قابل ذکر ہے (تحریک آزادی

میں علمائے کرام کا حصہ۔ص:220) 1911ء میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کے ساتھ مولانا رحمانی گیا تشریف لائے، (حیات ابوالمحاسن، محاسن التذکرہ ص:142؛ حیات سجاد، ص:1915ء) میں دورۂ حدیث شریف سے فارغ ہوئے۔ (قرآن محکم ص12 کے حاشیہ میں)

مفتی اختر امام عادل قاسمی نے محاسن التذکرہ کے حاشیہ میں لکھا ہے: مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں حضرت مولانا محمد سجاد کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوگئے، یہاں کے بعد دیوبند تشریف لے گئے اور 1332ھ یا 1333ھ مطابق 1913ء یا 1914ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ (حیات ابوالمحاسن ص254)؛ مگر 1914/1913ء بلکہ اس کے بعد کے کئی سال کے فارغین وفضلاء دارالعلوم دیوبند میں کہیں بھی مولانا عبدالصمد رحمانی کا نام موجود نہیں ہے، دوسری بات یہ ہے کہ اگر فاضل دیوبند ہوتے، تو مفتی ظفیر الدین مفتاحی اور دیگر قلمکار اس بات کو جلی حروف میں لکھتے؛ حالاں کہ کہیں بھی ایسا موجود نہیں ہے، اس میں لکھا ہے کہ فراغت 1913 یا 1914 میں ہوئی ہے، یہ بھی درست معلوم نہیں ہوتا ہے؛ کیوں کہ ''قرآن محکم'' کے حاشیہ میں درج ہے کہ 1915ء میں آپ صحاح ستہ کے دورۂ حدیث شریف کے درس میں مصروف ومشغول تھے (ص:15)

حضرت مونگیری کی حلقۂ ارادت میں

مروجہ نصاب کی تکمیل کے بعد اصلاحِ قلب کی خاطر مولانا نے خود کو قطب الارشاد، عالم ربانی حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ سے وابستہ کرلیا، اور انھیں کے دستِ حق پرست پر بیعت کا شرف اور روحانی فیض حاصل کیا۔ (کتاب الفسخ والتفریق ص26) (نقیب 21 مئی 1973ء ص16)

معقولات کی تعلیم

اس زمانے میں ہر طرف معقولات کا غُلغُلہ تھا، آپ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، صوبۂ سرحد (موجودہ مغربی پنجاب پاکستان) کے مشہور قصبہ ''غورغشتی'' میں معروف معقولی عالم حضرت مولانا قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ اپنے فن کے امام سمجھے جاتے تھے، اور ہندوستان بھر میں ان کو شہرت ومقبولیت حاصل تھی، جب آپ درسیات سے فارغ ہوئے، تو ان کی علمی شہرت سن کر 1916ء میں غورغشتی اپنے مرشد کی اجازت واطلاع کے بغیر ہی چلے گئے اور ان کے پاس رہ کر اپ نے ان سے شرح اشارات، شرح مطالع اور محاکمات جیسی اونچی کتابیں بالاستیعاب پڑھیں، ممکن ہے اس ذوق کی تکمیل میں سالوں مصروف رہتے؛ لیکن آپ کے مرشد قطب عالم حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش تھی کہ معقولات میں زیادہ وقت نہ لگایا جائے، مولانا عبدالصمد رحمانی تک ان کا

یہ جملہ پہنچا کہ ’’کیا اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے؟ جو اِن کتابوں کے پڑھنے کے لیے وہ وہاں گیا ہے‘‘ مرشد کامل کا یہ جملہ سنتے ہی آپ نے کتاب بند کردی، آپ سمجھ گئے کہ مرشدِ کامل کو یہ پسند نہیں، فوراً اپنے مشفق استاذ مولانا قطب الدین صاحب کی خدمت میں پہنچ کر درخواست کی کہ اب میں گھر جانا چاہتا ہوں؛ کیوں کہ مجھے پاگل نہیں ہونا ہے، اور استاذ گرامی قدر کی اجازت ورضامندی سے وہاں سے سیدھے خانقاہ رحمانی مونگیر حضرت شیخ کے پاس آ گئے، آپ کے اس جذبۂ طاعت سے حضرت مونگیری بہت خوش ہوئے۔ (قرآن محکم) قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ نے یہی واقعہ تھوڑے الگ انداز میں رقم کیا ہے، ان کے بقول فراغت کے بعد مولانا رحمانی حضرت مونگیری سے بیعت ہوئے، ابتداء میں علومِ معقولہ کی طرف رجحان زیادہ تھا، (محاسن التذکرہ۔ص:254) لہٰذا شیخ کی اجازت و اطلاع کے بغیر منطق کی بعض کتابیں پڑھنے صوبہ سرحد میں کابل سے قریب غورغشتی چلے گئے، یہ مولانا شمس الحق معقولی کا گاؤں تھا، مولانا اپنے وقت میں معقولات کے امام مانے جاتے تھے، مولانا رحمانی نے کچھ کتابیں معقولات کے امام سے پڑھیں، اور مونگیر تشریف لے آئے۔

فرماتے تھے کہ میں نے اپنے مرشد سے ڈرتے ڈرتے کہا کہ معقولات کی بعض کتابیں پڑھنے غورغشتی گیا تھا، حضرت مونگیری نے فرمایا: لاحول ولاقوۃ الا باللہ، اس سے کیا حاصل؟ معقولی کے مزار پر جاکے دیکھو، تاریکی محسوس ہوگی، اور ایک محدث یا فقیہ کی قبر پر جاؤ، انوار ہی انوار نظر آئیں گے۔ مرشد کی رائے سامنے آئی، تو مرید نے ارادہ بدل دیا، اور منطق وفلسفہ سے دلچسپی ہٹا کر ساری توجہ قرآن وحدیث اور فقہ پر مرکوز کردی۔ (کتاب النفیس۔ص:26)۔

قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کا یہ مضمون مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کی وفات کے اٹھائیس سال بعد لکھا گیا ہے، جس میں درج ہے کہ مولانا رحمانی کے معقول کے استاذ مولانا شمس الحق معقولی ہیں؛ جب کہ مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ کا مقالہ ’’قرآن محکم‘‘ کا جزء بن کر مولانا رحمانی کے زمانۂ حیات میں 1956ء مطابق 1386ھ میں طبع ہوا، یقیناً آپ نے اسے پڑھا ہوگا، اگر غلط ہوتا تو ضرور تصحیح کراتے؛ اس لیے درست یہی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے معقولات کے استاد جامع المعقول والمنقول شیخ العلماء حضرت علامہ مولانا قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ غورغشتی تھے، مشاہیر علماء سرحد میں مرقوم ہے کہ مولانا گل حسن ہزاروی، مولانا قاضی عبدالسبحان ہزاروی، مولانا نیاز محمد بنوی، مولانا فضل ربانی متھراوی پشاوری وغیرہم جیسے بہت سے اہل علم نے مولانا قطب الدین غورغشتوی سے استفادہ کیا۔

خانقاہ رحمانی

1916ء میں اپنے پیر ومرشد قطب عالم حضرت مونگیریؒ کی خواہش پر معقولات کی تعلیم چھوڑ کر اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ابتداء میں آپ کو کتب خانے کی ذمہ داری ملی، کتابوں کے درمیان شب وروز گزارنے سے فکر ونظر میں وسعت پیدا ہوئی، دنیائے علم کے مخفی راز آپ پر مزید روشن ہوگئے، پھر افتاء کا اہم شعبہ آپ نے سنبھالا، اور فقہ وفتاویٰ کا کام احسن طریقے پر انجام دیا، عرصے تک اپنے شیخ ومرشد کے نام آنے والے خطوط کی پیشی کی خدمت آپ ہی انجام دیتے تھے۔ آپ انتہائی فعال، ذمہ دار، اور اپنی ذمہ داریوں کے معیار پر پورا اترنے والے انسان تھے۔ (قرآن محکم)

مولانا رحمانی نے خانقاہ رحمانی کو اپنا دوسرا گھر بنایا، کتب خانہ رحمانیہ ہی میں رہتے، صرف پڑھنا لکھنا ہی ان کا کام تھا، اور بقیہ وقت مرشد کی صحبت اور خدمت میں گزارتے۔ (کتاب الفسخ ص:27)

درس قرآن: مولانا رحمانی جامع مسجد مونگیر کے امام بھی رہے، حضرت مولانا کی زمانۂ امامت میں مونگیر کے تعلیم یافتہ طبقہ میں قرآن پڑھنے اور سمجھنے کا ایک ذوق پیدا ہوگیا تھا، مونگیر والوں میں دین کا ذوق، اچھی تقریریں سننے اور اچھی تحریریں پڑھنے کا مذاق مولانا ہی کا پیدا کردہ ہے۔ (کتاب الفسخ۔ص:27)

خانقاہ رحمانی میں تدریسی خدمات

1927ء میں جب جامعہ رحمانی قائم ہوا، تو مولانا رحمانی علیہ الرحمہ اس میں مدرس مقرر ہوئے، مولانا رحمانی نے انجمن حمایت اسلام مونگیر میں بھی درسی خدمات انجام دیں۔ (کتاب الفسخ۔ص:27)

1917ء میں حضرت مولانا مفتی عبداللطیف رحمانی، صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی حیثیت سے مونگیر سے حیدرآباد تشریف لے گئے اور ان کے بعد مولانا مونگیری کے صاحبزادگان حضرت مولانا نوراللہ رحمانی صدر جمعیۃ علماء بہار اور مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت رابع بہار واڑیسہ کی تعلیم کی بات آئی تو یہ خدمت تدریس آپ ہی کو تفویض ہوئی۔ اسی زمانے میں مولانا عبدالصمد رحمانی نے انھیں صرف ونحو اور منطق کی متعدد کتابیں بھی پڑھائیں، آپ ایک اچھے مدرس، اور نرم دل مربی تھے، آپ اپنے ہر کام کو محبت، خلوص، انہماک اور تدبر کے ساتھ کرتے۔ (کتاب الفسخ 27)

ماہنامہ الجامعہ کی ادارت

ایک عرصہ تک خانقاہ رحمانی مونگیر سے شائع ہونے والے مشہور علمی ماہ نامہ ''الجامعہ'' کے مدیر بھی رہے۔

فتنوں کا تعاقب

ان دنوں بہار میں ''قادیانیت'' کا فتنہ زوروں پر تھا، پورا صوبہ قادیانیوں، اور عیسائی مشنریوں کی فتنہ انگیزی سے لرز رہا تھا، ایسے وقت میں آپ نے مجدد العلم والعرفان حضرت مولانا مونگیری کی زیر نگرانی ان باطل تحریکوں کے خلاف تحریری وتقریری جہاد میں حصہ لیا، اور اپنی بے بہا علمی وفکری صلاحیتوں سے قرآن وحدیث کی تبلیغ وترویج بھی فرماتے رہے، (نقیب 28 مئی 1973ء) انھیں مخلصانہ اور پیہم کوششوں کا نتیجہ مشرقی ہندوستان سے ان فتنوں کا قلع قمع ہونا ہے۔ (نقیب 21 مئی 1973ء) جب آریوں کی تحریک چلی، اس وقت مولانا عبدالصمد رحمانی خانقاہ رحمانی مونگیر میں تھے، ''رد آریہ'' میں بارہ رسائل لکھے، ''وید کا بھید''، اور ''آریہ دھرم کا انصاف''، وغیرہ بہت مقبول ہوئے۔ (کتاب الفسخ۔ص:28)

امارتِ شرعیہ میں آمد

جب مولانا سید محمد علی مونگیری 1927ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے، اور ملک کی سیاسی تحریک نے پلٹا کھایا، آر پار کی جنگ شروع ہوئی تو اس نازک وقت میں آپ اپنے استاد ورفیق، ہندوستان کے مشہور مفکر عالم دین حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد کے ایماء پر خانقاہ رحمانی سے امارتِ شرعیہ پھواری شریف پٹنہ منتقل ہوگئے، (نقیب 21 مئی 1973ء)

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے مولانا رحمانی کو امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کا ناظم نامزد کیا، اور دفتری امور کی ذمہ داری آپ کے سپرد ہوئی۔ آپ نے یہاں آتے ہی تنظیم امارت قائم کی، ہر علاقے میں امارت کے نقیب منتخب کیے، مسلم آبادی کو باہم مربوط کرنے کے لیے اور مقامی مسائل و معاملات حل کرنے کے لیے نقباء کی ذہن سازی کی، انھیں بانیِ امارت کی فکر کو آگے بڑھانے کے لیے اور وحدتِ امت کے لیے تیار کیا، آپ نے اس شرعی تنظیم کی ترقی واستحکام کے لیے اپنی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں وقف کردیں، اس کی تحریک کو زیادہ منظّم و فعال بنانے کے لیے دونوں ریاستوں کے اہم علاقوں کا دورہ کیا، اور زبان وقلم کے ذریعے فکر امارت کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا، ہر ہر علاقے میں دین ودعوت کا پیغام، اور امارت کے مقاصد کو عام کرنے کے لیے جہد مسلسل کیا۔ (ہمارے امیر۔ص 44) (نقیب 21 مئی 1973ء)

جمعیۃ علمائے ہند کے نائب ناظم

جب جمعیۃ علماء ہند نے سول نافرمانی (حرب سلمی) کی تجویز پاس کی، اور اکابر علماء کی گرفتاری

شروع ہوئی تب آپ 14 اکتوبر 1930ء کو جمعیۃ علماء ہند کے نائب ناظم اور مرکزی دفتر کے ذمہ دار اعلیٰ مقرر ہوئے، اس وقت کے سہ روزہ الجمعیۃ 23 جمادی الاولی 1349ھ مطابق 16 اکتوبر 1930ء میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہؒ صدر جمعیۃ علماء ہند نے اپنی گرفتاری کے وقت حضرت مولانا حسین احمد مدنی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کو اپنا قائم مقام نامزد فرمایا اور مولانا نور الدین نائب ناظم جمعیۃ علماء ہند کی جگہ مولانا عبدالصمد رحمانی کو نائب ناظم مقرر فرمایا، قائم مقام ناظم اس وقت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد تھے، آپ حضرت مولانا ابوالمحاسن، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہم اللہ کی قیادت میں ملی و سیاسی خدمات انجام دیتے رہے، اور بڑی تندہی سے ملک وملت کے پیچیدہ مسائل میں جمعیت علمائے ہند کے پلیٹ فارم سے عظیم خدمات انجام دیں۔ (نقیب 28 مئی 1973ء ص9) حضرت مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں: ''صدیق محترم مولانا مولوی عبدالصمد صاحب مونگیری صوبہ بہار کے متدین اور پرجوش کارکن ہیں۔'' (کتاب العشر ۔ص 41)۔

تھانہ بھون کے فتویٰ کا جواب

جب آپ جمعیۃ علماء ہند کے نائب ناظم کی حیثیت سے ملی و سیاسی قیادت فرما رہے تھے، اس سیاسی شور وشغب کے بیچ بھی آپ کا قلم رواں دواں تھا، ''الجمعیۃ'' کے اس زمانے کے شمارے آپ کی تحریروں کے محافظ ہیں، دوقومی نظریہ پر تھانہ بھون سے فتاویٰ جاری ہوا، آپ نے اس فتویٰ کا مدلل جواب لکھا، جو الجمعیۃ دہلی میں بیس پچیس قسطوں میں شائع ہوا، آپ نے ادب واحترام کے دائرہ میں رہ کر اختلاف ومخالفت میں فرق ملحوظ رکھا، جواب میں آپ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مقام بلند، اور عظمت کا بھی خیال رکھا، یہی وجہ ہے کہ مولانا رحمانی کی اس خوبی اور حسنِ ادب کو تھانوی مکتب فکر سے وابستہ حضرات نے خوب سراہا۔ (قرآن محکم ص 11) یہ مقالات دیکھنے یا پڑھنے کا مجھے موقع نہیں مل سکا؛ لیکن ان کی دیگر تصانیف کے انداز تحریر، اور قوتِ استدلال کی وجہ سے یقین کامل ہے کہ ان کی یہ کتاب سیاسی فراست کا آئینہ دار ہوگی۔

مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے ناظم

1935ء کے ایکٹ کے تحت جب 1937ء میں الیکشن ہوا، تو مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے نام سے ایک جماعت بنائی اور اس کے نام پر الیکشن لڑا، جیت گئے اور ساڑھے تین ماہ کی وزارت بھی بنائی، اس مختصر عرصے میں بہار کی سرکاری عدالتوں اور دفتروں میں اردو کو اس کا

حق دلایا، اس پورے زمانے میں مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کا پورا دفتر مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کے سپرد رہا، جسے آپ نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ چلایا۔ (قرآن محکم ص 12) (ماہنامہ رفیق علمائے بہار نمبر۔ص 142) جس سے آپ کی سیاسی دقت نظری اور انتظامی صلاحیت کا خوب مظاہرہ ہوا۔

الہلال پٹنہ: انڈیپنڈنٹ پارٹی کا ترجمان اخبار الہلال (پٹنہ) جاری ہوا، تو آپ مولانا مسعود عالم ندوی کے ساتھ اس کے مدیر بھی رہے۔ (مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد: ص 204) (حیات سجاد ص 1)۔

نائب امیر شریعت ثانی

17 شوال 1359ھ مطابق 18 نومبر 1940ء میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی وفات ہوئی، تقریباً چار سال تک نیابت کا یہ عہدہ خالی رہا، مولانا عبدالصمد رحمانیؒ اس منصب کے تمام فرائض اور ذمہ داریاں بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، چار سال بعد 8 ربیع الثانی 1364ھ مطابق مارچ 1945ء کو امیر شریعت ثانی نے آپ کو امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کا نائب امیر شریعت منتخب کیا۔ اس وقت حضرت امیر شریعت ثانی مولانا شاہ محی الدین قادریؒ نے یہ فرمان لکھا: مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد سے ادارہ امارتِ شرعیہ میں نائب امیر شریعت کی جگہ خالی تھی، عملاً اگرچہ مولانا عبدالصمد رحمانی ناظم امارت شرعیہ نیابت کے بعض امور انجام دیتے رہے تھے؛ لیکن ضابطہ کے طور پر وہ اس منصب کے لیے مامور نہیں کیے گئے تھے، ان چار سال کے کام نہایت اطمینان بخش ہیں اس وقت بجز اس کے کہ مولانا مرحوم کی مجمع الکمالات ذات سے ادارہ امارت شرعیہ محروم ہے، اور جس کا بدل بظاہر ہندوستان میں نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بحمد اللہ تعالیٰ ادارہ امارت شرعیہ اپنے ہر شعبہ میں بہتر حالت میں ہے، جو مولانا رحمانی کی اہلیت اور ان کی مخلصانہ کارگذاری کا عملی ثبوت ہے۔ ضرورت داعی تھی کہ اس منصب نیابت کا جلد ہی اعلان ہوتا؛ مگر مشیت الٰہی کے ہاتھوں مختلف وجوہ کی بناء پر تعویق پر تعویق ہوتی رہی، آج 8 ربیع الثانی 1364ھ یوم جمعہ کو مولانا عبدالصمد رحمانی کا تقرر عہدۂ نیابت امارت پر کر دیا گیا۔ کل سنیچر کے دن سے کارہائے مفوضہ کی طرف متوجہ ہو کر عمل شروع کر دیں۔ اَیَّدَہُ اللّٰہُ تعالیٰ بِنَصْرِہٖ وَبَارَکَ فِیْ اَمْرِہٖ. (امارت شرعیہ: دینی جدوجہد کا روشن باب۔ص 115)

مولانا رحمانی بانیِ امارت شرعیہ حضرت ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے مزاج شناس اور حقیقی جانشیں تھے، قیامِ امارت کے ابتدائی زمانے سے ہی مولانا کے ساتھ رہے، نظامِ امارت شرعیہ کو منتشر ہونے سے بچانے کے لیے آپ کی جدوجہد اور اخلاص وایثار نے بڑا سہارا دیا، آپ کی حکمت عملی اور وسعت

ظرفی نے اس ادارہ کو کئی مقامات پر انتشار سے بچایا، آپ کی زندگی امارت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں گزری، ملت کو درپیش مسائل اور اس کے حل کے لیے جہد مسلسل اور سعی پیہم کا اندازہ لگانا ہو تو مولانا کی تصانیف دیکھیے، لگتا ہے قوم کا درد مولانا کے سینے میں ہر وقت ٹیس مارتا رہتا تھا۔ (دینی جد وجہد۔ص:114)

آپ 33 سال تک نائب امیر شریعت کی حیثیت سے قوم وملت کی خدمت کرتے رہے، آپ نے نائب امیر شریعت کی حیثیت سے تین امراء کے دور پائے، فراخ دلی اور خلوص کے ساتھ ملک و ملت کی تعمیر وترقی میں مصروف رہے۔

دارالعلوم دیوبند کے رکن شوریٰ

1954ء میں آپ دارالعلوم دیوبند کے رکن شوریٰ منتخب ہوئے، اور تاحیات اس منصب پر فائز رہے، اور اکابر کے اس قیمتی اثاثہ کی حفاظت وخیر خواہی میں سرگرم رہے۔ (دارالعلوم دیوبند کی جامع و مختصر تاریخ۔ص:756)۔

تصنیفی خدمات

مولانا کا اصل ذوق تصنیف وتالیف کا تھا، آپ کی تمام تصانیف علمی جواہر پاروں، اور تحقیقات پر مبنی ہیں، آپ فقہ اسلامی پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے، مولانا کی ناقابل فراموش ایثار وقربانی، بلند و پاکیزہ افکار، اور صالح خصوصیات، دینی، علمی، ادبی سیاسی، تاریخی، سماجی اور تحقیقی کارنامے جو ہزاروں صفحات پر بکھرے پڑے ہیں، وہ اربابِ علم وفن کے ذوق کی تشنگی بجھانے اور شیدائیانِ دین متین کی روح کو تسکین دینے کے لیے بڑی حد تک کافی ہیں، (نقیب 28 مئی 1973ء ص 9) مولانا کی علمی و تحقیقاتی افکار آپ کی تمام تصانیف میں چمکتی نظر آئیں گی، آپ کے فقہی نکات بے حد اہم اور آپ کی آراء مناسب وموزوں ہوا کرتی تھی، اصابتِ رائے علمی حلقوں میں مسلم تھی، (نقیب 21 مئی 1973ء ص 16) آپ اونچے درجے کے فقیہ، اور روحانی کمالات کے حامل تھے، (نقیب جون 1973)

آپ کا قلم حق پرستوں پر ہونے والے حملوں کے بالمقابل ایک سنگ گراں اور چٹان تھا، آپ زبان وقلم کے ایک جری سپاہی تھے، آپ کے قلم سے عوام کے دلوں میں عمل کا جذبہ پیدا ہوا۔

حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی اپنے وقت کے بڑے علماء اور اصحاب تحقیق میں تھے، اور مختلف علوم اسلامی میں دستگاہ رکھتے تھے، علوم القرآن، فقہ اسلامی، مذاہبِ باطلہ، اور فرق ضالہ کا رد آپ کی تحریر کا خاص موضوع تھا، فکر سجاد سے نہ صرف یہ کہ آپ کو والہانہ تعلق تھا؛ بلکہ آپ اس فکر کے نقیب و

ترجمان تھے؛ چنانچہ حضرت مولانا کے ایماء پر آپ نے ''مسئلۂ امارت اور ہندوستان'' لکھی، جو دارالکفر میں قیامِ امارت پر بحث وتحقیق کے باب میں حرفِ آخر کہی جاسکتی ہے، فسخ وتفریق کے احکام کی بابت آپ کا مختصر رسالہ ''کتاب الفسخ والتفریق'' قضاۃ ومفتیان اور علماء وعوام سبھوں کے لیے دلیل راہ ہے۔(کتاب العشر والزکوۃ۔ص22)۔

نظام قضاء کے سلسلہ میں آپ کی تالیف آدابِ قضاء نہایت اہم ہے، ''کتاب العشر والزکوۃ'' میں عشر وزکوٰۃ کے شرعی احکام تفصیلی انداز میں بیان کیے گئے ہیں، یہ کتاب بجائے خود آپ کے وسعتِ مطالعہ، عمق نظر، اور غیر معمولی فقہی بصیرت کی آئینہ دار ہے، ''تلخیص الاتقان'' اور ''تیسیر القرآن'' آپ کی نہایت مفید نصابی کتابیں ہیں، جو بہت سے مدارس اسلامیہ میں داخل نصاب ہیں، مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی بورڈ سے ملحق مدارسِ عربیہ کے وسطانیہ چہارم کے نصاب میں تیسیر القرآن داخل تھی، یہ کتاب مبتدی طلباء کو بتدریج عربی ترکیب سمجھنے اور پڑھنے کے لیے اچھی کتاب ہے۔(کتاب العشر والزکوۃ۔ص25)۔

''تلخیص الاتقان'' علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی ایک مقبول وجامع ''کتاب الاتقان فی علوم القرآن'' کی تلخیص ہے۔

امارت کی فکر تو مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی ہے؛ لیکن حضرت مولانا اپنے فکر کو قلم بند نہ کرسکے، حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ نے ہندوستان اور مسئلۂ امارت اور ''کتاب العشر والزکوۃ'' لکھ کر اس فکر کو قلم بند کیا۔(کتاب الفسخ۔ص28)

مولانا مودودی کے نظریات اور دعاوی سامنے آئے تو آپ نے ان کے رد میں مدلل علمی گفتگو کی، جو کئی جلدوں میں دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوئی، ''جماعت اسلامی پر تبصرہ'' میں مولانا مودودی کے دعاوی، ہندوستانی اسلام اور ان کے دار الاسلام اور جدید معنی اسلام اور بنیادی عقیدے پر تنقید ہے۔

''جماعتِ اسلامی کا دینی رخ'' چار جلدوں میں ہے، اس میں مولانا نے مولانا مودودی کی واقعی اور سندی حقیقت، پھر ارتقائی حالت، ان کے مجتہدانہ دعاوی، ان کی مہذب گالیوں، اور قائدانہ اور داعیانہ نوازشات کا نمونہ، اور ان کے اصل اسلامی نصب العین اور اس کی طرف پیش قدمی کے سیدھے راستے پر تنقید وتبصرہ۔

ایک جلد میں مولانا مودودی کے تین اصولی نظریئے اور عقائد پر بحث کی گئی ہے، (1) قرآن

مجید کے متعلق ان کا کیا عقیدہ ہے؟ (2) انبیاء علیہم السلام کے متعلق ان کا کیا عقیدہ ہے؟ (3) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور امت مسلمہ کے مشن کے متعلق ان کا کیا عقیدہ ہے؟ اس سلسلہ میں ان کی گمراہیوں اور کتاب وسنت کی مخالفت پر روشنی ڈالی گئی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کو کس سمت کی طرف لے جارہے ہیں۔''

(ادارہ نشرواشاعت دارالعلوم دیوبند نے کتاب کے سرورق پر یہ خلاصہ درج کیا ہے)

''تاریخ امارتِ اسلامی ہند کے سیاسی دور اور اس کے انقلابی اور آئینی ماحول کے کیا اثرات مرتب ہوئے، ہندوستان پر امارتِ شرعیہ کا فریضہ کب عائد ہوا، کس طرح عائد ہوا، اور اکابر امت علماء کرام نے اس فریضہ کی ادائیگی میں کیا قربانیاں پیش کیں، نظامِ امارت کا لائحہ عمل کیا ہے، اس سلسلہ کی تمام باتیں اس کتاب میں آگئی ہیں، مختصر یہ کہ تاریخ امارت 1803ء سے 1941ء تک کی اسلامی ہند کی انقلابی اور آئینی جدوجہد کی تاریخ ہے، اور اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔''

(تاریخ امارت کی پشت پر یہ لکھا ہوا ہے، اور راقم نے بھی کتاب دیکھی ہے، انتہائی جامع اور مفصل تاریخ ہے)

مولانا عبدالصمد رحمانیؒ نے اپنے اخیر زمانے میں حضرت اقدس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح پر ایک خاص جہت سے قلم اٹھایا، اور خوب لکھا، خانقاہ رحمانی مونگیر ہی کے کتب خانہ میں بیٹھ کر لکھتے تھے، جب تھک کر باہر نکلتے، تو کبھی کبھی علامہ شبلی کا یہ قطعہ پڑھتے۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

(کتاب الفسخ، ص28)

سیرت پر آپ کی کتاب ''پیغمبرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم'' کے نام سے موسوم ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومی بعثت اور آپ کی عالمی دعوت کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے، اسی طرح آپ کی ایک کتاب ہے، ''تذکرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' اس کتاب میں محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو نرالے انداز میں صفحات کی زینت بنایا گیا ہے، آپ نے انبیاء علیہم الصلاۃ والتسلیم، حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کے تذکرہ اور ان

کی زندگیوں کو عام فہم انداز میں لکھا ہے، قوم میں صالح فکر پیدا کرنے کے لیے اس طرح کے بیسیوں رسائل لکھے: ''فاطمہ کا چاند''، ''صحابہ کی انقلابی جماعت''، ''ایمان کی باتیں''، ''نماز کی باتیں'' اور ''حج کی باتیں''، اسی سلسلے کی اہم ترین کڑی ہیں۔

اسلوب تحریر: حضرت مولانا رحمانی کی تحریر بہت شگفتہ، رواں دواں اور عام فہم ہوتی ہے، (ص26) آپ کا اسلوب تحریر عوامی تھا، کسی تحریر میں مذکورہ بالا دونوں خصوصیات کا جمع ہوجانا نہایت نادر ہے، یہ خداداد ملکہ حق تعالیٰ نے مولانا کو عطا فرمایا تھا، مولانا رحمانی کا طرزِ استدلال حضرات اہلِ علم کی تسکین خاطر کا موجب بھی تھا۔ (کتاب العشر ص37)

تعداد تصانیف: مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ کے مطابق آپ کی کل تصانیف کی تعداد سڑسٹھ (67) ہے، کچھ لوگوں نے رسائل کو جوڑ کر سو سے زیادہ تعداد بتائی ہے۔

فن فقہ پر

(۱) کتاب الفسخ و التفریق، (سنہ اشاعت: 1387ھ مطابق 1967ء صفحات کی تعداد:240)، (۲) کتاب العشر والزکوۃ (سنہ اشاعت 1361ء 1941ء)، (۳) ازالہ شبہات از مسئلہ عشر و زکوٰۃ (سنہ اشاعت 15 رجب 1364 مطابق 1945 صفحات کی تعداد 131)، (۴) رہبری زکوٰۃ، زکوٰۃ کا مصرف اور اس کا شرعی نظام، (۵) قضا کے چند اہم مسائل، (۶) نئے تقاضوں کا حل شریعت کی روشنی میں، (۷) آدابِ قضا، (۸) کتاب القضاء، (۹) قضاء کیا ہے؟ (مولانا عبدالصمد رحمانی اور مولانا منت اللہ رحمانی کے مقالوں کا مجموعہ۔ یہ رسالہ امارت شرعیہ کی لائبریری میں موجود ہے)، (۱۰) غیر مسلموں کے جان و مال کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر، (۱۱) فتاویٰ رحمانیہ (فتاوی حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی)، (۱۲) اسلامیات وسیاسیات، (۱۳) اسلامی حقوق اور مسلم لیگ (سن اشاعت: 1938ء۔صفحات :66۔)، (۱۴) ایمان کی باتیں (سنہ اشاعت: 1979ء۔صفحات کی تعداد 239)، (۱۵) نماز کی باتیں (سنہ اشاعت 1954ء۔صفحات کی تعداد184)، (۱۶) حج کی باتیں، (۱۷) ہندوستان اور مسئلہ امارت (سنہ شاعت:1940ء۔صفحات 130)، (۱۸) خطبات، (۱۹) قتلِ مرتد، (۲۰) خطباتِ جمعہ، (۲۱) مقالاتِ امارت شرعیہ (اول)، مقالاتِ امارت شرعیہ (دوم)، (۲۲) اسلام میں عورت کا مقام، (۲۳) شرکت کونسل۔

قرآنیات

(۲۴) قرآنِ محکم (سنہ اشاعت 1966 مطابق 1386ھ صفحات کی تعداد 120)،

(۲۵) قرآن محکم پر تبصرے اور ان کا جائزہ، (۲۶) تیسیر القرآن، (۲۷) کلید تیسیر القرآن، (۲۸) تلخیص الاتقان۔

رد باطل

(۲۹) ویدکا بھید، حصہ اول، (۳۰) ویدکا بھید حصہ دوم، (۳۱) رویائے حقانی، (۳۲) آریوں کا خوفناک ایشور، (۳۳) قدامتِ اسلام، (۳۴) ابدی نجات، (۳۵) حدوثِ مادہ، (۳۶) حدوث روح، (۳۷) ابطالِ تناسخ حصہ اول، ابطالِ تناسخ (حصہ دوم)، (۳۸) نیست سے ہست تک، (۳۹) آریہ دھرم کا انصاف، (۴۰) علامہ مشرقی۔

ردمودودیت

(۴۱) جماعت اسلامی پر تبصرہ (حصہ اول) جماعت اسلامی پر تبصرہ (حصہ دوم) (سنہ اشاعت 1371ھ مطابق 1952ء صفحات کی تعداد 32)، (۴۲) جماعت اسلامی کا دینی رخ (اول)، جماعت اسلامی کا دینی رخ (دوم)، جماعت اسلامی کا دینی رخ (حصہ سوم) (سنہ اشاعت 1375ھ مطابق 1954ء۔صفحات کی تعداد 72)، جماعت اسلامی کا دینی رخ (حصہ چہارم)، (۴۳) جماعت اسلامی کے نظریات وافکار، (۴۴) جماعت اسلامی کے دعاوی، طریقۂ کار، اور خدمات کا جائزہ۔

تاریخ وسیر

(۴۵) پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم؛ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومی بعثت اور آپ کی عالمی دعوت کا تحقیقی جائزہ (سن اشاعت: 1961ء۔صفحات کی تعداد 346)، (۴۶) تذکرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، (۴۷) تذکرۃ آدم علیہ السلام، (۴۸) تذکرہ نوح علیہ السلام، (۴۹) تذکرۂ ہود علیہ السلام، (۵۰) تذکرہ صالح علیہ السلام، (۵۱) صحابہ کی انقلابی جماعت (سنہ اشاعت: 1969۔صفحات: 160)، (۵۲) فاطمہ کا چاند، (۵۳) حیاتِ سجاد (سنہ اشاعت 1360 مطابق 1941ء صفحات کی تعداد 158)، (۵۴) تاریخ امارت (سنہ اشاعت 1944ء مطابق 1363ھ صفحات کی تعداد 208)، (۵۵) انتخاب امیر رابع۔

(باقی آئندہ)

حضرت مولانا حکیم محمد احمد فیض آبادیؒ

سابق ناظم تعلیمات دارالعلوم، دیوبند

بقلم مولانا محمد اجمل قاسمی
استاذ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

دنیا سے سب کو جانا ہے، استاذ محترم حضرت مولانا حکیم محمد احمد فیض آبادی رحمہ اللہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے "كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالإِكْرَامِ" مولانا اپنی عمر طبعی پوری کر چکے تھے، ہر طرح کی خدمت سے معذور اور خود ہمہ وقت کسی خدمت گزار اور معاون کے محتاج تھے، یادداشت اور پہچان تقریباً ختم ہو چکی تھی؛ اس لیے ان کی وفات کی خبر ذہن و دماغ کے لیے کوئی غیر متوقع حادثہ نہ تھی؛ لیکن چوں کہ وہ ہمارے بڑے محسن اور کرم فرماں تھے، اس لیے دل و دماغ نے ان کی وفات پر صدمہ محسوس کیا، اللہ رب العزت حضرت والا کی مغفرت فرمائے، اور انھیں ان کی دینی و علمی خدمات کا بہترین صلہ عطا فرمائے! آمین!

حضرت مولانا کی دینی و تعلیمی خدمات کا دورانیہ پچاس سال سے متجاوز ہے، اس طویل مدت میں آپ نے پانچ دینی مدارس میں اپنی تدریسی و انتظامی خدمات پیش کیں، اور جہاں بھی رہے اپنی قوتِ کار، قوتِ کردار، اعلیٰ تدریسی صلاحیت، اخلاص و بے لوثی، محنت و جانفشانی اور حسنِ انتظام و انصرام کے روشن نقوش چھوڑے۔

تدریسی سفر کا آغاز

حضرت مولانا نے اپنے تدریسی سفر کا آغاز فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی رحمہ اللہ کے ایما پر جامعہ قاسمیہ ''گیا'' بہار سے کیا، جہاں مولانا کے رفقائے تدریس میں حضرت مولانا سید ارشد مدنی دامت برکاتہم اور حضرت مولانا قاری محمد عثمان منصور پوری رحمہ اللہ بھی تھے ''گیا'' میں مولانا نے درسِ نظامی کی مشکل کتابیں پڑھائیں، نحو و صرف کی ابتدائی کتابیں قواعد کے اجراء کے

ساتھ پڑھانے کی طرح ڈالی، کتابیں بھرپور تیاری سے پڑھاتے، ابتدائی کتابوں میں نوٹس لکھواتے، خود بھی محنت کرتے اور طلبہ سے بھی بھرپور محنت لیتے، تکرار ومطالعہ کے اوقات میں ان کی نگرانی فرماتے۔ تعلیم وتربیت سے بھرپور دلچسپی، بہترین تدریسی صلاحیت، اور طلبہ کے تئیں خلوص وہمدردی، ان کی تعلیمی نگرانی نیز منظم اور اصول پسند زندگی کی وجہ سے آپ نے جلد ہی انتظامیہ وطلبہ کی نظر میں اونچا مقام حاصل کرلیا، اور دونوں ہی طبقے مولانا کی صلاحیتوں اور خوبیوں کے معترف اور قدردان ہوئے، حضرت مولانا کے برادرزادے اور عزیز شاگرد حضرت مولانا خورشید انور قاسمی صاحب نے بتایا کہ مدرسہ قاسمیہ گیا کے مہتمم حضرت مولانا قاری فخرالدین صاحبؒ جو شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے خلیفہ تھے، مولانا سے ان کی تعلیمی خدمات اور مدرسہ کے تئیں ان کی جانفشانی کے سبب بڑا لگاؤ رکھتے تھے، خط وکتابت میں ہمیشہ علامہ محمد احمد صاحب کے لقب سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ غرض بہار کے اس علاقے میں جامعہ قاسمیہ ''گیا'' حضرت مولانا کی مساعی جمیلہ کی بدولت اپنے بہتر تعلیمی نظام کے حوالے سے اتنا معروف ومشہور ہوا کہ اس کی مختصر عمارت طلبہ کے لیے ناکافی ہوگئی۔

جامعہ قاسمیہ ''گیا'' میں حضرت مولانا کو مقبولیت تو خوب ملی؛ مگر وہاں کی آب وہوا آپ کو زیادہ راس نہ آئی؛ چنانچہ تقریباً ہر سال بیمار پڑجاتے، خود اپنا علاج کرتے، کبھی ڈاکٹر سے بھی رجوع کرنے کی ضرورت پڑجاتی، بیماری میں بھی وہ اپنے تدریسی معمولات برقرار رکھتے، درس گاہ جانے کی ہمت نہ ہوتی تو اپنے کمرے میں ہی بلاکر طلبہ کو پڑھاتے۔ بار بار کی علالت سے دل برداشتہ ہوکر ''گیا'' کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کیا، والد صاحب کی بھی رائے ہوئی کہ ''گیا'' کے بجائے قریب ہی میں کہیں تدریسی خدمت انجام دیں؛ تاکہ صحت بہتر ہوسکے؛ چنانچہ اپنے گاؤں کے قریب مدرسہ انوارالعلوم بھولے پور، امبیڈکرنگر کے ذمہ داروں کی درخواست پر وہاں سے وابستہ ہوگئے، گیا سے جدائیگی کا فیصلہ وہاں کی انتظامیہ اور طلبہ دونوں کے لیے تکلیف دہ تھا؛ چنانچہ جامعہ قاسمیہ گیا میں پڑھنے والے عربی ششم کے طلبہ حضرت مولانا سے پڑھنے کے لیے اپنے علاقہ کا مدرسہ چھوڑ کر وطن سے دور ایک گمنام مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھولے پور آگئے۔

حضرت مولانا نے مدرسہ انوارالعلوم میں کام شروع کیا، اور تھوڑے ہی دنوں میں مدرسہ کے تعلیمی نظام کو بہت مستحکم اور مضبوط بنادیا، مدرسہ کے بام ودر تکرار ومذاکرے کے غلغلے سے معمور ہوگئے اور مدرسہ کو پورے علاقے میں بڑی شہرت ملی، مولانا نے یہاں رہتے ہوئے کھیتی بھی بڑی لگن سے کی اور پیداوار بھی خوب ہوئی؛ لیکن مولانا یہاں بھی زیادہ مدت قیام نہ کرسکے، مولانا مزاجاً نظم

وانتظام اورطلبہ کی تادیب میں سخت واقع ہوئے تھے،آپ کی سختی کو لے کر کچھ لوگوں کو شکایت تھی، مولانا کی عدم موجودگی طلبہ اور بارچی میں کسی بات پرلڑائی ہوگئی،جس کو بہانہ بنا کر بعض مقامی لوگوں نے شورش برپا کردی،جس کی وجہ سے مولانا وہاں سے خاموشی کے ساتھ علاحدہ ہوگئے، مدارس میں شورش سے مولانا کوسخت نفرت تھی، ہنگاموں میں شریک ہونے کے بجائے علاحدگی کوترجیح دیتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ میں گھر تک کا سفرخرچ محفوظ رکھتا ہوں؛ تاکہ بوقت ضرورت بلاپس وپیش روانہ ہوسکوں، بھولے پور سے ''مدرسہ فرقانیہ'' گونڈہ چلے گئے، وطن سے دوری کا فیصلہ مولانا کے لیے شاق تھا؛لیکن اس کے نتائج آپ کے حق میں بہتر نکلے،مولانا نے ایک دفعہ ایک بھولے پوری طالب علم سے فرمایا کہ بھولے پور سے میری علاحدگی بھولے پور کے لیے جیسی بھی رہی ہو میرے حق میں تو بہتر ثابت ہوئی، میں وہاں رہتا تو کھیتی کسانی میں ضائع ہوکر رہ جاتا اور علمی ترقی کی وہ راہیں میرے لیے شاید نہ کھلتیں، جو وہاں سے علاحدہ ہونے کے بعد کھلیں۔ بہرحال حضرت مولانا کے بھولے پور سے علاحدہ ہوتے ہی وہاں کی رونقیں جلد ہی ماند پڑ گئیں جس کو ہر خاص وعام نے شدت سے محسوس کیا، مولانا نے یہاں جلالین تک کتابیں پڑھائیں۔

مدرسہ فرقانیہ گونڈہ میں

مدرسہ فرقانیہ گونڈہ میں پہلے آپ تعلیم حاصل کر چکے تھے،کم وبیش چار سال آپ نے یہاں تدریسی خدمات انجام دیں،سابقہ دونوں مدرسوں کی طرح یہاں بھی متوسطات تک تعلیم تھی؛ چنانچہ آپ نے یہاں ہدایہ اول،شرح جامی،قطبی وغیرہ کتابیں پڑھائیں،تعلیم ودارالاقامہ کی نگرانی کے ساتھ آپ یہاں نائب مہتمم بھی رہے،زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ مدرسہ کے ذمہ داروں میں اختلافات رونما ہوئے،جس کی وجہ سے مولانا وہاں سے ''مدرسہ شاہی'' چلے گئے ،دارالعلوم دیوبند سے آپ کی فراغت ۱۳۷۸ھ ہوئی، پانچ سال مزید دیوبند میں علوم وفنون کی تکمیل اورفن طب کی تحصیل میں گذارنے کے بعد آپ نے تدریس کے میدان میں قدم رکھا تھا،تو گویا آپ کی تدریس کی شروعات کا سال ۱۳۸۲ھ ہوگا اور مدرسہ شاہی میں آپ کا تقرر ۱۳۹۴ھ میں ہوا،اس اعتبار سے مدرسہ قاسمیہ گیا سے لے کر فرقانیہ گونڈہ تک آپ کی تدریسی مدت گیارہ، بارہ سال ہوتی ہے،آپ کی تدریس کا یہ دور گویا ایک عبوری دور ہے،اس کے بعد پھر آپ کی تدریسی زندگی میں ٹھہراؤ اور استحکام کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔

جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں

جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں آپ کا تقرر ۱۰/ذی قعدہ ۱۳۹۴ھ میں درجۂ وسطی میں

ہوا،اور۳؍محرم الحرام۱۳۹۵ھ سے آپ نے یہاں تدریسی خدمت کا آغاز کیا، حضرت مولانا سیدارشد مدنی دامت برکاتہم جومدرسہ قاسمیہ گیا میں حضرت مولانا کے ساتھ تھے، وہ پہلے ہی وہاں سے جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد آچکے تھے،اور ناظم تعلیمات کے عہدے پر فائز تھے،مدرسہ شاہی میں حضرت مولانا کا تقرر درحقیقت حضرت مولانا ارشد مدنی کی سعی پرخلوص کا نتیجہ تھا جسے فخرالمحدثین حضرت مولانا فخرالدین مرادآبادی کی تائید حاصل رہی،مولانا مدنی دامت برکاتہم بحیثیت ناظم تعلیمات ۱۶شوال۱۳۹۴ھ کومجلس شوری مدرسہ شاہی کے نام اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں:

''مولانا محمد احمد صاحب حضرت مولانا سیدفخرالدین صاحب کے منتخب کردہ ہیں،اورمناسب ہیں،راقم الحروف بھی ان سے واقف ہے، نیز مجھ کودارالطلبہ کے نظم میں ان سے زیادہ مدد مل سکے گی؛ اس لیے میری گذارش ہے کہ اگرموصوف ہی کا تقرر کرلیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا''۔(تاریخ شاہی نمبر۳۴۸)

(راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ مذکورہ بالاتحریر پرتاریخ ۱۶شوال۱۳۹۴ھ ہے؛ حالاں کہ حضرت مولانا فخرالدین صاحب کی وفات ۲۱صفر۱۳۹۲ھ ہے،حضرت مولانا ارشد مدنی صاحب نے جو یہ تحریرفرمایا کہ مولانا محمد احمد صاحب مولانا سیدفخرالدین کے منتخب کردہ ہیں،قیاس یہ ہے حضرت فخرالمحدثین کی زندگی میں مولانا محمد احمد صاحب کے تقرر کا مسئلہ آیا ہوگا، جسے مولانا نے پسند کیا ہوگا؛ کیوں کہ مولانا محمد احمد صاحب آپ کے معتمد تلامذہ میں تھے۔)

مدرسہ شاہی میں گذرے ہوئے ماہ وسال حضرت مولانا کی حیات مستعار کا سنہرا دوراور تعلیمی خدمات کا بہترین زمانہ ہے،مدرسہ شاہی میں آپ کے عزم وحوصلے کو ایک بڑی جولان گاہ میسر آئی، جہاں آپ کی تدریسی اورانتظامی صلاحیتوں کے بہترین جوہر سامنے آئے اور بہترین مصرف میں استعمال ہوئے، مدرسہ شاہی سے پہلے آپ نے جوخدمات انجام دیں اس نے آپ کی شخصیت سازی، آپ کے مس خام کوکندن بنانے اورایک نوفارغ التحصیل کوایک تجربہ کار مدبر ومدرس بنانے میں بنیادی کردارادا کیا؛ چنانچہ مولانا نے مدرسہ شاہی میں ایک قابل وفاضل اور باتوفیق مدرس کی حیثیت سے نحومیر سے لے کرصحیح بخاری تک کی تقریباً تمام ہی کتابیں پوری کامیابی اوراستادانہ مہارت کے ساتھ پڑھائیں اورتدریس کے حوالے نہایت قابل اعتماد،محترم اورنیک نام رہے،تدریسی میدان میں حضرت مولانا کی ہمہ جہت خدمات کا اندازہ ان کتابوں سے ہوتا ہے جومختلف سالوں میں آپ کے زیرتدریس رہیں،آپ نے مدرسہ شاہی میں رہتے ہوئے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھائیں، جب

کہ ابتدائی چھ سالوں کی تفصیلات فراہم نہ ہوسکیں۔

بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، موطا امام مالک، نسائی، ابن ماجہ، شمائل ترمذی، طحاوی، مشکاۃ، شرح عقائد، تفسیر جلالین، حسامی، تفسیر بیضاوی، ہدایہ، مختصر المعانی، نورالانوار، کنزالدقائق، سلم العلوم، ملاحسن، شرح جامی، اصول الشاشی، شرح وقایہ، ترجمہ قرآن، کافیہ، شرح تہذیب، روضۃ الأدب، نحومیر۔

مدرسہ شاہی میں آپ نے مختلف اوقات میں مختلف ذمہ داریاں سنبھالیں اور مدرسہ کے تعلیمی نظم وانتظام کو بہتر اور معیاری بنانے میں نمایاں اور قابل قدر کردار ادا کیا، تعلیم کے ساتھ طلبہ کی تربیت کی خدمت انجام دی، قیام کے بیشتر زمانے میں دارالاقامہ کی نظامت اور نگرانی کی ذمہ داری انجام دی، مختلف اوقات میں نائب مہتمم، نائب ناظم تعلیمات، ناظم تعلیمات، شیخ الحدیث اور صدر المدرسین کے عہدے پر فائز رہے، اور مدرسے کے انتظام واستحکام میں حصہ لیا، مدرسہ شاہی کے سابق مہتمم حضرت مولانا رشیدالدین حمیدی رحمہ اللہ کو حضرت مولانا پر بڑا اعتماد تھا، مولانا حمیدی رحمہ اللہ نہیں چاہتے تھے کہ حضرت مولانا مدرسہ شاہی چھوڑ کر دارالعلوم دیوبند جائیں؛ چنانچہ حضرت مولانا کو دارالعلوم دیوبند سے تدریس کے لیے جب بلایا گیا، اور مولانا آمادہ بھی ہوگئے، تو مولانا حمیدیؒ نے سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب سے باقاعدہ ایک سال کے لیے مدرسہ شاہی میں حضرت مولانا کے قیام کی منظوری لی؛ چنانچہ حضرت مولانا نے مولانا حمیدیؒ کی خواہش پر ایک سال مزید مدرسہ شاہی میں قیام کیا اور پھر دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔

مدرسہ شاہی میں الوداعی خراج عقیدت

حضرت مولانا کو مدرسہ شاہی میں کیسا وقار واعتبار اور کیسی ہردلعزیزی حاصل تھی، اس کی عکاسی اس خراج عقیدت سے ہوتی ہے جو مدرسہ شاہی کے اساتذہ کی طرف سے حضرت مولانا کو دارالعلوم دیوبند تشریف لے جانے کے موقع پر پیش کیا گیا، یہ خراج عقیدت اور تہنیت نامہ راقم الحروف کو حضرت مولانا کے برادرزادے حضرت مولانا خورشید انور قاسمی استاذ حدیث مدرسہ شاہی سے فراہم ہوا، جس پر ۱۱ ذی قعدہ ۱۴۱۱ھ کی تاریخ درج ہے، ذیل میں اس تہنیت نامہ کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

''حضرت صدر المدرسین جامعہ! ہم اس حقیقت کے اظہار میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتے کہ ہم سبھی اساتذہ جامعہ آپ کے بارے میں ایک کامیاب مدرس ہونے کے ساتھ اس بات کا یقین

رکھتے ہیں کہ آپ کا علم ہمدوشِ عمل اور بے پایاں علم کا آئینہ دار ہے۔ منطق وفلسفہ، بلاغت ومعانی میں آپ کو تبحر اور حدیث وتفسیر اور فقہ میں مہارت تامہ حاصل ہے، ہم آپ کے حددرجہ متواضع، منکسر المزاج اور خوددار ہونے کی شہادت پیش کرتے ہیں، اور اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ آپ کا تدبر وتفکر اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ فکر ونظر میں غلطی کا امکان کم ہی رہ جاتا ہے، آپ نظم ونسق میں ماہر ہیں، آپ کے یہاں ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے، کوئی چیز اپنے وقت سے موخر نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ حضرت مہتمم صاحب کے زیر نگرانی آپ نے مدرسہ شاہی کے تمام شعبوں کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے وہ کارنامے انجام دیے ہیں جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی....''

مدرسہ شاہی میں آپ کے قیام کی کل مدت ۱۷ سال رہی۔

مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں

مدرسہ شاہی میں آپ شیخ الحدیث اور صدر المدرسین کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے اور اہمیت ومقبولیت بھی اللہ نے خوب دی تھی؛ اس لیے دارالعلوم دیوبند سے جب تدریس کے لیے دعوت آئی تو آپ کے بہت سے اعزاء اور محبین کی رائے یہی تھی کہ حضرت مولانا کو مدرسہ شاہی میں رہ کر ہی کام کرنا چاہیے؛ اس لیے کہ جو مقام ومرتبہ اور کام کرنے کے جو مواقع انھیں فی الحال یہاں میسر تھے دارالعلوم دیوبند میں اس کی توقع نہیں تھی، حضرت مولانا کے چھوٹے بھائی مولانا ابوبکر صاحب مرحوم جو حضرت مولانا کی نظر میں صائب الرائے وصاحبِ فہم تھے ان کی بھی یہی رائے تھی؛ مگر مادر علمی سے مولانا کو جو والہانہ تعلق تھا، وہ ہر چیز پر حاوی رہا، ایسے تمام مخلصین کے لیے حضرت مولانا کی طرف سے ایک ہی جواب تھا اور وہ یہ کہ ''دارالعلوم مجھے اگر جھاڑو دینے کے لیے بلائے گا تو بھی میں جاؤں گا'' چنانچہ حضرت مولانا تشریف لے گئے اور ان کا جانا دارالعلوم کے حق میں بہتر ثابت ہوا اور بقول مولانا خود ان کے حق میں بھی بہتر ثابت ہوا۔ (ان تفصیلات میں سے کچھ کو تو راقم الحروف نے براہ راست حضرت سے سنی ہیں، اور کچھ کو ان کے قابل اعتماد اعزاء سے)

۱۴۱۱ھ میں امیدوں کے نشیمن مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں آپ کا تقرر عمل میں آیا، اور ۱۴۳۹ سال تک آپ نے تعلیمی وانتظامی شعبوں میں اپنی بہترین خدمات پیش کیں، ایک طرف جہاں آپ نے ہزاروں تشنگان علوم نبوت کو فیض یاب کیا وہیں مدرسہ کے تعلیمی وتربیتی نظام کو بہتر اور مستحکم کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا، دارالعلوم دیوبند میں آپ کا قیام کم وبیش 28 سال رہا، اس عرصے میں زیادہ تر آپ سے ہدایہ آخرین اور مشکاۃ المصابیح کے اسباق متعلق رہے۔

دارالعلوم دیوبند میں آپ کا زندہ جاوید کارنامہ

کار آمد اور مفید تحقیق وتالیف ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے آدمی کا فیض عموماً تادیر قائم رہتا ہے، اوراس کی نیکیوں کے دفتر میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، مولانا تصنیف وتالیف کے آدمی بالکل نہ تھے؛ مگر توفیق الٰہی نے ان سے ایک ایسا بنیادی کام لیا جس کا فیض سدا قائم اوراجر وثواب ان شاء اللہ دائم رہے گا۔

حضرت مولانا نے ایک مرتبہ غالباً میرے استفسار پر یا ازخود فرمایا کہ دارالعلوم دیوبند میں منتہی درجات کی تعلیم تو ہمیشہ اچھی رہی؛ مگر ابتدائی درجات کی تعلیم دارالعلوم دیوبند کے لحاظ سے کمزور اور غیر معیاری تھی، حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) ابتدائی درجات کی تعلیم کے سلسلے میں فکرمند تھے، میں جب دارالعلوم میں پہنچا تو حضرت مولانا نے مجھے مدرسہ ثانویہ کی ذمہ داری قبول کرنے کو کہا، دارالعلوم جیسے ادارے میں جہاں بڑے لوگ موجود تھے میرے لیے یہ بڑی آزمائش تھی، بہرحال حضرت مہتمم صاحب کا جب اصرار ہوا تو میں نے اللہ بھروسے یہ ذمہ داری قبول کرلی، اورثانویہ کی تعلیم کو بہتر بنانے کے سلسلے میں بڑے اساتذہ سے مشورے کیے؛ مگر کام کی کوئی بہتر صورت سامنے نہیں آئی؛ بلکہ بعض لوگوں کے تبصرے میرے لیے مایوس کن بھی رہے، ایک صاحب نے فرمایا کہ مدرسہ ثانویہ کو مولانا وحیدالزماں صاحب جیسا دبنگ آدمی نہ قابو کرسکا تو آپ کیا کرسکیں گے، ایک صاحب نے کہا کہ دارالعلوم میزان ومنشعب پڑھانے کے لیے قائم کیا گیا ہے؟

بہرحال میں نے کام شروع کردیا، میں نے ترتیب یہ بنائی کہ صبح وشام پہلا گھنٹہ لگنے سے پہلے میں اپنے دفتر پہنچ جاتا، اور جوطلبہ لیٹ آتے ان کی تادیب کرتا، تھوڑے دنوں میں ہی تقریباً سبھی طلبہ وقت پر مدرسہ پہنچنے لگے، اسباق کی حاضری کا نظام بہتر ہوگیا، ادھر میرے وقت پر پہنچنے کی وجہ سے اساتذہ میں بھی وقت پر حاضری کا اہتمام پیدا ہوا، مدرسہ ثانویہ کے تعلیمی نظام کی سب سے بڑی کمزوری یہی تھی کہ وہاں اسباق کی حاضری کا نظام بہت ہی ڈھیلا تھا، الحمداللہ بغیر کسی بڑی کاروائی اورمشقت کے اس پر قابو کرلیا گیا۔

پھراس کے بعد طلبہ کے ماہانہ جائزے کا سلسلہ شروع کیا، جس کے نتائج طلبہ کے سامنے آتے، اس سے طلبہ میں محنت ولگن اورایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر پیدا ہوئی، تدریس اور نتائج کی بہتری کے حوالے سے اساتذہ کی فکرمندی میں بھی اضافہ ہوا، اسی طرح مغرب بعد طلبہ کو اساتذہ کی

نگرانی میں تکرار و مذاکرے کا پابند بنایا گیا، اس ترتیب سے رفتہ رفتہ مدرسہ ثانویہ کا نظام اور اس کا تعلیمی معیار اتنا بہتر ہوگیا کہ وہ دوسرے مدرسوں کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ بن گیا۔

حضرت مولانا نے فرمایا کہ میں نے غور کیا کہ مولانا وحیدالزماں صاحب کو مدرسہ ثانویہ کے نظام کو سدھارنے میں کامیابی کیوں نہیں ملی، تو اس کی وجہ مجھے یہ سمجھ میں آئی کہ مولانا بلاشبہ ایک بہترین منتظم اور مدبر تھے؛ مگر ان کی ذمہ داریاں اور مصروفیات چوں کہ بہت زیادہ تھیں؛ اس لیے وہ مدرسہ ثانویہ کو وہ وقت نہیں دے سکتے تھے جو اس کی نگرانی کے لیے ضروری تھا؛ اس لیے وہ کامیاب نہ ہوسکے۔

مولانا نے فرمایا کہ ثانویہ کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے سلسلے میں جو میں نے کام کیے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰنؒ صاحب مہتمم دارالعلوم اس کی وجہ سے میری بڑی قدر کرتے تھے، اور بڑی محبت کا معاملہ فرماتے تھے۔

بہرحال مدرسہ ثانویہ کا استحکام اور اس کا بہترین نظام مولانا کا ایک بے مثال کارنامہ اور ان کے حسنِ انتظام کا بہترین نمونہ ہے، جس سے آج بڑی تعداد میں بہترین اور جیدالاستعداد طلبہ نکل رہے ہیں، اور دور و قریب مدارس میں جابجا اس کی تقلید جاری ہے، مولانا نے مدرسہ ثانویہ کو ایک ایسی مستحکم اور منظم حالت میں چھوڑا ہے کہ افراد اور منتظمین کے بدلنے سے ان شاء اللہ العزیز اس کے ضیاع کا خطرہ پیدا نہیں ہوگا۔

مدرسہ ثانویہ میں حضرت مولانا نے جو یہ کارہائے نمایاں انجام دیے، ان میں حضرت مولانا ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم کی سرپرستی کا بھی اہم کردار ہے، مولانا مدنی ناظم تعلیمات تھے، اور مولانا محمد احمد صاحب ان کے نائب و معاون، ظاہر یہ ہے کہ مولانا نے جو کچھ بھی کیا وہ مولانا مدنی کی سرپرستی اور بھرپور تعاون کے بغیر ان کے لیے ممکن نہ تھا۔

شعبۂ تعلیمات کا انتظام وانصرام

ثانویہ کے علاوہ تعلیمات کے ماتحت انجام پانے والے دیگر کاموں میں بھی مولانا محمد احمد صاحب مولانا مدنی دامت برکاتہم کے بہترین معاون اور مخلص شریک کار رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شعبۂ تعلیمات میں ان دونوں بزرگوں کی جوڑی بہترین جوڑی رہی، اور ان دونوں حضرات کی وجہ سے اس شعبہ کا وقار و اعتبار نہایت بلند ہوا۔

حضرت مولانا ارشد مدنی دامت برکاتہم کے نظامت تعلیمات سے مستعفی ہونے کے کچھ سال

بعد حضرت مولانا رحمہ اللہ ناظم تعلیمات بھی بنائے گئے؛ لیکن آپ کی نظامت کا زمانہ مختصر ہی رہا، شعبۂ تعلیمات جیسے اہم شعبے کو چلانے کے لیے بڑی توانائی، حاضر دماغی اور کشادہ ذہنی درکار تھی، مولانا کے قوی اب مضمحل ہو چکے تھے، یادداشت بکثرت ذہول کا شکار ہونے لگی تھی، پھر مولانا عہد کہن کی پیداوار اور ہر چیز کو روایتی انداز میں چلانے کے عادی تھے؛ حالاں کہ زمانے کے تقاضے بدل چکے تھے، ان وجوہات کے سبب مولانا جلد ہی نظامت سے مستعفی ہو گئے، بہرحال نائب ناظم تعلیمات رہ کر انہوں نے جو بہترین کارکردی پیش کی وہ ان کی زندگی کا شاہ کار ہے۔

حضرت مولانا کا اندازِ تدریس

مولانا ایک بہترین اور کامیاب مدرس تھے، ان کے عہد شباب کے شاگردوں میں ان کے لیے جو گرویدگی اور والہانہ لگاؤ دیکھا وہ شاگردوں میں اساتذہ کے حوالے سے خال خال ہی دیکھنے کو ملتا ہے، ان کے قدیم شاگردوں میں بعض ایسے ملے جو تنقید کے نشتر چلانے میں بڑے بے رحم واقع ہوئے تھے؛ مگر مولانا کا نام آیا تو ان کا انداز سراپا ادب و تعظیم ہو گیا، اور وہ مولانا کی تدریس کے بڑے مداح نظر آئے، ہمیں مولانا سے ابتدائی کتابیں پڑھنے کا موقع نہیں ملا؛ مگر جن کو ملا ان کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ فنون (نحو وصرف و منطق، بلاغت) کی ابتدائی کتابوں میں مولانا کا انداز یہ تھا کہ وہ تعریفات و قواعد طلبہ کو ازبر کراتے تھے، اور پھر مثالوں میں قواعد کے اجرا پر زور دیتے تھے، وہ طلبہ کے سامنے مثالوں کا اجرا کر کے ان کو یاد کرنے کا پابند بنانے کے بجائے طلبہ کو مکلّف کرتے کہ محنت کر کے از خود اجرا کریں، اس میں ابتدا میں طلبہ پر زور زیادہ پڑتا ہے؛ مگر تھوڑے ہی دنوں میں اجرا طلبہ کے لیے کھیل اور تفریح ہو جاتا ہے، حضرت مولانا نے یہ طریقہ اپنے استاذ حضرت مولانا ضیاء الحقؒ صاحب برہی عادل پور فیض آباد سے اخذ کیا تھا، حضرت مولانا کے بقول مولانا ضیاء الحق فیض آبادیؒ استاذ مدرسہ ضیاء العلوم مانی کلاں، جون پور ابتدائی کتابوں کی تدریس کے مجتہد تھے، کافیہ جیسی مشکل سمجھی جانے والی بعض کتابوں میں مولانا طلبہ کو کاپی بھی لکھایا کرتے تھے؛ تاکہ طلبہ کو استاذ کی منشا کے مطابق استاذ ہی کے الفاظ و انداز میں سبق یاد کرنے میں سہولت ہو۔

عام کتابوں کی تدریس میں مولانا کا نہج یہ تھا کہ عبارت پڑھواتے، طالب علم کوئی غلطی کرتا تو اس کی اصلاح کرتے، عبارت میں کوئی قابلِ وضاحت چیز ہوتی تو اس کی وضاحت کرتے، مشکاۃ المصابیح کے اسباق میں الفاظِ حدیث کی تشریح کرتے، پھر مختصر انداز میں عبارت کا مطلب بیان کرتے، اور متعلقہ ضروری تشریح کرنے کے بعد عبارت پر اسے منطبق کرتے، ان کا کوئی سبق نہ تو

سرسری ہوتا اور نہ ہی اس میں بہت زیادہ تحقیق وتدقیق ،اورطول طویل بحثیں ،وہ ہر ہر مسئلے اور ہر ہر حدیث پر رکتے اورضروری توضیح وتشریح کے بعدآگے بڑھتے ،ان کے یہاں روزآنہ کے سبق کی مقدار متعین تھی، وہ نصاب کوتعلیم کے دنوں پر تقسیم کرلیتے ،اوراسی کے مطابق پورے سال پڑھاتے، سال کے پہلے سبق میں جوانداز ،رفتاراورکیفیت ہوتی آخری سبق تک وہی باقی رہتی ،اس میں ذرا بھی فرق نہ آتا تھا۔

ہم نے مولانا سے مشکاۃ المصابیح کا آخری حصہ پڑھا،مولانا کے اسباق بڑے دلچسپ رہے، سبق میں وہ موقع محل کے اعتبار سے اشعاروواقعات بھی سناتے تھے، کتاب الرقاق پڑھاتے ہوئے وہ بکثرت آبدیدہ ہوجاتے ،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے متعلق احادیث پڑھاتے ہوئے مولانا پراس قدررقت طاری ہوئی کہ سلسلہ کلام جاری رکھنا مشکل ہوجاتا، گویا یہ اسباق انہوں نے روایتی انداز کے ساتھ ان کیفیات کے ساتھ بھی پڑھائے جوان ابواب کے پڑھنے سے مقصود ہیں، وہ ایک طبیب حاذق بھی تھے،اس لیے مشکاۃ میں کتاب الطب میں ان کے دروس بہت پسند کیے جاتے تھے''الحبۃ السوداء'' (کلونجی دانہ) کی افادیت پراحادیث آئیں تو حضرت مولانا اپنے ساتھ کلونجی کے دانے لے کرآئے اورطلبہ کو بتایا کہ یہ'' الحبۃ السوداء'' ہے۔بہرحال مشکاۃ میں مولانا کے اسباق دلچسپ ہونے کے ساتھ پراثر بھی ہوتے تھے؛البتہ ہدایہ ثالث میں بوڑھاپے کی وجہ سے ذہول کا اثر کچھ کچھ ظاہر ہونے لگا تھا، بیانِ مسئلہ یا بیانِ مذاہب میں کبھی کبھی چوک ہوجایا کرتی ،متنبہ ہونے پر جس کا وہ استدراک کرتے۔

مولانا اسباق اورعام حالات میں ٹھہرکر بولنے کے عادی تھے،آواز پست تھی، وہ نہ خطیب تھے نہ خطیبوں کی طرح لسّان، اسباق ہمیشہ تیاری اورمطالعہ سے پڑھاتے تھے،دورانِ مطالعہ ضروری باتوں کوقلمبند کرنے کا بھی مزاج تھا۔

مولانا کا نظم وانتظام

مولانا جہاں بھی رہے نظم وانتظام کی ذمہ داریاں ان کے ساتھ لگی رہیں،اورانہوں نے ان ذمہ داریوں کو بڑی محنت وجانفشانی اوراخلاص وبےلوثی سے انجام دیا،مولانا کوئی سماجی اوررابطۂ عامہ کے مد کے آدمی نہ تھے؛اس لیے مدارس کے خارجی امور سے ان کو نہ کوئی مناسبت تھی،اورنہ ہی اس طرح کی ذمہ داریاں مولانا سے کبھی وابستہ ہوئیں؛البتہ وہ داخلی نظم وانتظام کوسنبھالنے اورتعلیم وتربیت کومستحکم بنانے کی بہترین صلاحیت کے مالک تھے،اللہ تعالی نے ان کوزبردست قوت ارادی،اعلی درجہ کا عزم

وحوصلہ اور غیر معمولی قوت تنفید سے نوازا تھا؛ چنانچہ جب وہ کسی چیز کی ٹھان لیتے تھے تو اسے کر گذرتے تھے، ایک دفعہ ذکر کیا کہ مدرسہ شاہی میں امتحانات میں دورۂ حدیث کے طلبہ بڑی بے اصولیاں کیا کرتے تھے، بہت سے طلبہ امتحانات میں دھڑلے سے نقل کرتے، بعض طلبہ امتحان میں شریک ہی نہ ہوتے تھے کہ ضمنی امتحان میں آسانی سے پاس ہوجائیں گے، متنبہ کرنے پر نہ سنتے تھے اور نہ مانتے تھے، اور ذمہ دارانِ مدرسہ اس لحاظ میں ان پر سختی اور کاروائی کرنے سے کتراتے تھے کہ کہیں وہ مدرسہ چھوڑ کر چلے نہ جائیں گے، مولانا نے فرمایا: اس صورت حال سے میں فکرمند تھا اور میں نے امتحان کے نظام کو درست کرنے کا ارادہ کیا، بعض ذمہ داروں کو تشویش ہوئی کہ طلبہ شورش برپا کریں گے؛ مگر میں نے اطمینان دلایا کہ سب قابو میں آجائے گا، فرمایا: طلبہ نے جیسا کہ توقع تھی امتحان سے پہلے ہنگامہ شروع کیا کہ ہم امتحان میں شریک نہیں ہوں گے؛ مگر میں ڈٹا رہا کہ امتحان تو شفافیت کے ساتھ ہی ہوگا، جسے شریک ہونا ہے، شریک ہو، نہیں شریک ہونا ہے تو چلا جائے، امتحانات شروع ہوگئے اور طلبہ نے شرکت بھی کی؛ مگر بار بار تنبیہ کے باوجود حسبِ سابق کچھ طلبہ نقل کرنے سے باز نہ آئے، میں نے ایسے طلبہ کے پرچے سوخت کردیے، ادھر ضمنی امتحانات میں بھی میں نے سختی کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی دو امتحان کے بعد نظام درست ہوگیا، اور امتحانات میں شفافیت پیدا ہوگئی۔

مولانا کا خیال تھا اور بجا تھا کہ معیاری اور صاف ستھرے امتحانات کے بغیر معیار تعلیم کبھی بھی بہتر نہیں ہوسکتا، اور وہ ہمیشہ اسی سوچ کے تحت کام کرنے کے عادی رہے۔

مولانا کی ذاتی زندگی مرتب تھی، ان کی طبیعت کا خمیر نظم وضبط کی پابندی اور اصول پسندی سے اٹھا تھا، جس ضابطے یا اصول کو وہ نافذ کرنا چاہتے خود سو فیصد اس پر پورے اترتے تھے؛ اس لیے لوگوں کو ان پر انگشت نمائی کا زیادہ موقع نہ ملتا تھا، مولانا اصول کے نافذ کرنے میں بے لچک تھے؛ حالاں کہ بعض خاص صورتوں میں استثنائی معاملات ناگزیر ہوجاتے ہیں، مولانا کی یہ سخت گیری بعض دفعہ لوگوں کے لیے شکایت اور بددلی کا سبب بنتی تھی؛ لیکن مولانا کو کسی سے ستائش کی توقع ہوتی نہ خفگی کی پرواہ۔

تعلیم کے ساتھ تربیت

مولانا تعلیم کے ساتھ تربیت پر بھی توجہ دیتے تھے، اور جہاں بھی طالب علم سے کوئی غلطی ہوتی فوراً تنبیہ کرتے، اور اس تنبیہ میں زبان، ہاتھ اور قلم کا استعمال کرنے میں قطعاً گریز نہ کرتے، درس گاہ، گذرگاہ، مدرسہ، مسجد، دسترخوان، سفر وحضر ہر جگہ حضرت مولانا کو دیکھنے کا موقع ملا، ہر جگہ انھیں روک

ٹوک اورغلطیوں پرتنبیہ کرتے ہوئے پایا،ان کی طبیعت میں جلالی رنگ غالب تھا،لہذاان کی تنبیہ اکثر غصے کے انداز میں ہی ظاہر ہوتی تھی۔مولانا کہا کرتے تھے کہ اساتذہ پہلے طلبہ کے ساتھ دارالاقامہ میں ہی رہا کرتے تھے،جس کی وجہ سے وہ ہمہ وقت اساتذہ سے مربوط رہتے تھے،ان کی خدمت کیا کرتے تھے جس سے انھیں زندگی کے بہت سے آداب اورقرینے اساتذہ سے سیکھنے کو ملتے تھے اورتعلیم کے ساتھ تربیت بھی ہوتی رہتی تھی،پھراساتذہ کی ضرورتوں کا خیال کرتے ہوئے فیملی کواٹرس بنائے گئے،اس سےاساتذہ کوتو یقیناً بڑی راحت ملی؛مگر طلبہ اپنے اساتذہ کی صحبت سے محروم ہوگئے،اوران کی تربیت کا بڑا نقصان ہوا۔

اخلاق وعادات

حضرت مولانا جس خاندان کے وارث وامین تھے وہ علاقے میں اپنی دینی عزیمت وصلابت، اسلامی غیرت وحمیت،منکر پر برملا نکیر کرنے کی رندانہ جراءت،ذوقِ عبادت وتلاوت، امانت ودیانت،معمولات کی پختگی،اورمحنت وجفاکشی وسخت کوشی میں ممتاز ومعروف؛ بلکہ ان خوبیوں کی وجہ سے دل پسند اورمحبوب بھی رہاہے،مردوں کے ساتھ گھر کی عورتوں میں بھی یہ اوصاف بہت نمایاں تھے،زمانے کی نیرنگیوں نے نئی نسل کواپنی خاندانی روایات کے بارے میں سست اورغافل ضرور کردیا ہے؛مگراس نسل میں بھی متعدد افراد ہیں جواپنے خاندانی امتیازات کوباقی رکھے ہوئے ہیں،ہمارے گھرانے کی مولانا کے گھرانے سے رشتہ داریوں کا سلسلہ پرانااورنزدیکی رہاہے،گاؤں بھی بالکل قریب قریب ہیں؛اس لیے آمدورفت بھی خوب ہے،بریں بنا راقم الحروف اس خاندان کے احوال سے گھر کے فرد کی طرح واقف ہے۔

حضرت مولانا کوان تمام خاندانی خصوصیات وامتیازات سے وافر حصہ ملا تھا،امانت ودیانت کا عنصر بہت نمایاں تھا،ان کے کاموں میں احتساب کی روح پائی جاتی تھی،ان کے اندرورع وتقوی اورفکرآخرت تھی،وہ معاملات کے صاف،زبان کے کھرے،بات کے سچے،اوردھن کے پکے تھے، عیاری ومکاری،چالاکی وچرب زبانی،نفاق ودورنگی اورسیاسی بازی گری سے ناآشنا تھے،وہ نظام الاوقات کے حددرجہ پابند اوراصول پسندی میں فرد تھے،درس وتدریس ہو،انتظام وانصرام ہو،کھان پان ہو،یازندگی کی دیگرمصروفیات ومعمولات ان کی پوری زندگی نظم وضبط کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی،وہ فطری طور پران باتوں کے خوگر تھے،اوراپنی زندگی کے تمام مراحل میں اس حوالے سے وہ جانے پہچانے گئے،مولانا میں فطرتاً سخت گیری اورغصے کا عنصر غالب تھا؛اس لیے ہرکس ناکس کے

لیے مولانا کو نبھانا آسان نہ تھا، بہت سے طلبہ مولانا کی سختی کی تاب نہ لاکر تعلیم سے دور بھی ہوگئے، اور جنہوں نے برداشت کرلیا وہ عموماً سنور گئے اور کسی لائق ہوگئے؛ البتہ وقت، حالات اور عمر کے گذرنے کے ساتھ ان کے مزاج میں خاصی تبدیلی پیدا ہوگئی تھی، ان کے دوستوں، بے تکلف ملنے جلنے والوں اور نیازمندوں کی فہرست بہت طویل نہ تھی؛ لیکن جو بھی دوست یا نیازمند تھے وہ بہت پکے، حددرجہ مخلص اور بے لوث محبت کرنے والے تھے، اور حضرت مولانا بھی ان کے لیے ریشم کی طرح نرم اور حددرجہ مہربان تھے، ہمارے ایک خاندانی چچا مولانا یسین صاحب تھے جو دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا قمرالدین گورکھ پوری دامت برکاتہم کے ہم درس تھے، حضرت مولانا سے ان کا بڑا یارانہ تھا، مولانا کے بعض عزیزوں نے بتایا کہ مولانا یسین صاحب ملاقات کے لیے اگر مولانا محمد احمد صاحب کے گھر جاتے تو مولانا ان کو چھوڑنے ان کے گھر تک جاتے، اور جب مولانا ان سے ملاقات کرنے ان کے گھر آتے تو وہ مولانا کو چھوڑنے ان کے گھر تک جاتے؛ حالاں کہ دونوں گاؤں کا فاصلہ تقریباً تین کلومیٹر ہے، ہم نے بھی اس مشایعت کا ایک منظر دیکھا ہے، جو مولانا کے مزاج ومذاق کو دیکھتے ہوئے ہم جیسوں کے لیے باعثِ حیرت تھا۔

مولانا رشتوں کو جوڑنیوالے، تعلقات کو نبھانے والے، مہمان نواز اور مہمانوں کی آمد سے خوش ہونے والے تھے، راقم الحروف نے بارہا ان باتوں کا مشاہدہ کیا ہے۔

شب وروز

مولانا کا ایک نظام الاوقات تھا جس پر وہ سختی سے عامل تھے، موسم یا مصروفیات کی کمی بیشی سے اس پر کوئی فرق نہ پڑتا تھا، وہ طلوع فجر سے ایک گھنٹہ پہلے لازماً اٹھ جاتے، تہجد ادا کرتے اور درسی کتب کے مطالعہ میں لگ جاتے، فجر کا سلام پھیرتے ہی عموماً وہ دارالاقامہ کے اپنے حلقہ کا جائزہ لیتے، نماز میں کاہلی برتنے والوں کو تنبیہ کرتے، باز نہ آتا تو اس کی سیٹ کاٹ دیتے تھے، اس کے بعد گھر آکر قرآن پاک کی تلاوت کرتے، کچھ وقت بچتا تو مطالعہ کرتے، کبھی کوئی مریض آجاتا تو اس کو دیکھتے، اور پھر ناشتہ اور مدرسہ کی تیاری میں لگ جاتے۔

وقت سے پہلے مدرسہ پہنچ جاتے، دوپہر کو کھانے کے بعد لازماً تھوڑی دیر قیلولہ کرتے، ظہر بعد مدرسہ آتے، عصر بعد مریضوں کے علاج میں مشغول رہتے، یہی لوگوں سے ملاقات کا بھی وقت تھا، مریضوں کو دیکھتے اور دوائیں تجویز کرتے، اور مہمانوں کی چائے سے ضیافت کرتے، وہ ایک سند یافتہ طبیب حاذق تھے، جہاں بھی رہے درس وتدریس کے ساتھ علاج ومعالجے اور دواسازی کا سلسلہ بھی

قائم رکھا، مریض اگر باقی رہتے تو مغرب بعد بھی دیکھتے ورنہ مغرب بعد کا وقت مطالعہ کتب میں استعمال ہوتا، کھانا اور نماز عشاء سے فارغ ہوکر دس بجے تک اسباق کی تیاری اور مطالعے میں مشغول رہتے، اور دس بجے لازماً بستر پر چلے جاتے، تمام نمازیں مسجد میں باجماعت ادا کرنے کے عادی تھے۔

فجر بعد کی نیند ان کے نزدیک قابلِ نفرت عادت اور ناقابل معافی جرم تھا، نہ کبھی خود سوتے، نہ گھر والوں کو سونے دیتے، اہل تعلق میں کسی کے بارے میں معلوم ہوجائے کہ وہ فجر بعد سوتا ہے، تو اس پر سخت ناراضگی اور تعجب کا اظہار کرتے، بدقسمتی سے فجر کے بعد تھوڑی سی نیند بادہ صبوحی کی لت کی طرح میرے ساتھ بھی لگی ہوئی ہے، اس کے بغیر اسباق بیداری اور بیدار مغزی کے ساتھ پڑھنا پڑھانا مشکل ہوتا ہے، میں اپنی اس لت کی وجہ سے ہمیشہ مولانا کے عتاب سے خائف رہا۔

گھریلو حالات

آپ موضع پریتم پور ضلع فیض آباد (موجودہ امبیڈکر نگر) میں پیدا ہوئے، تاریخ پیدائش یکم رمضان المبارک بروز جمعہ ہے، اور سن پیدائش غالباً ۱۳۵۴ ہے، انگریزی اعتبار سے تاریخ پیدائش ۱۰؍نومبر ۱۹۳۷ء لکھی گئی ہے۔

حضرت مولانا کے بیان کے مطابق ان کے والد حاجی عبدالرحمٰن خان صاحب چھوٹے سے ایک زمین دار، اور صوم وصلاۃ کے پابند تھے؛ مگر جہالت اور ناواقفیت کی وجہ سے تعزیہ داری، محرم اور ڈھول تاشہ کی رسمیں گھر میں انجام پاتی تھیں، پھر شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سے تعلق ہوا تو دینداری کی طرف مائل ہوئے، اور اپنے بچوں کو دینی تعلیم دینے کا ارادہ کیا، مولانا کل پانچ بھائی تھے، جن میں تین الحمدللہ عالم باعمل اور دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل تھے، بڑے بھائی مولانا جمال الدین صاحب حضرت مدنی کے شاگرد تھے، مولانا نے فرمایا کہ بڑے بھائی جب پڑھ کر آئے، تو انہوں نے گھر خاندان میں جو غلط رسمیں رائج تھیں ان پر تنبیہ شروع کی، اور والد صاحب بے چوں وچرا ان کی باتوں پر عمل کرتے گئے، جن رسموں میں وہ جی جان سے شریک رہا کرتے تھے ان سے یکسر علاحدگی اختیار کرلی۔ حاجی عبدالرحمٰن صاحب وضع داری، مہمان نوازی اور غریب پروری میں مشہور تھے، ان کی دینداری اور خلوص ہی کا فیض ہے کہ آج ان کے پوتوں اور نواسوں میں اکثریت حافظ اور خاصی تعداد علماء کی ہے، جن میں کئی ایک دینی خدمات میں بھی مشغول ہیں۔

طالب علمی

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی مولانا جمال الدین صاحب سے حاصل کی، حفظ

قرآن حضرت مولانا قاری عبدالوہابؒ بانی مدرسہ فرقانیہ گونڈہ کے پاس شروع کیا، پھر قاری خان زمان صاحبؒ استاذ فرقانیہ گونڈہ کے پاس مکمل کیا، اور سترہ سال کی مدت میں حافظ قرآن ہوگئے، مولانا اپنے گاؤں کے پہلے حافظ تھے؛ اس لیے پورے علاقے میں وہ پریتم پور والے ''حافظ جی'' کے نام سے جانے جاتے رہے، بہت بعد میں لوگوں نے ان کے نام کے ساتھ مولانا کا سابقہ اور استاذ دارالعلوم کا لاحقہ لگانا شروع کیا۔

فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم آپ نے مدرسہ ضیاء العلوم مانی کلاں ضلع جونپور میں پائی، یہاں آپ کے استاذ مولانا عبدالرحیم فیض آبادی، اور مولانا ضیاء الحق فیض آبادی تھے، یہ دونوں بزرگ راقم الحروف کے گاؤں برہی عادل پور کے رہنے والے تھے، اول الذکر فارسی اور ثانی الذکر ابتدائی عربی درجات کی تدریس کے حوالے سے بہت مشہور تھے، حضرت مولانا آخر الذکر کے بہت ہی مداح تھے، اور انہیں ابتدائی عربی کتب کی تدریس کا مجتہد کہتے تھے، اس کے بعد آپ نے مدرسہ فرقانیہ گونڈا داخلہ لیا، آپ کافیہ میں داخلہ چاہتے تھے؛ لیکن آپ کے خصوصی استاذ مولانا افضال الحق جوہر قاسمی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے امتحان لینے کے بعد مولانا کی خواہش کے علی الرغم شرح جامی پڑھانا شروع کردیا، اس طرح آپ کا ایک سال بچ گیا، مولانا جوہر قاسمی سے آپ کو بہت لگاؤ تھا، اور مولانا جوہر قاسمی بھی آپ کو بہت عزیز رکھتے تھے، شوال ۱۳۷۴ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلے کے لیے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی معیت میں دیوبند تشریف لے گئے، ٹانڈہ سے دیوبند تک حضرت کا ساتھ رہا، پھر حضرت ہی سے بیعت وارادت کا تعلق بھی قائم ہوگیا، اور قیام دارالعلوم کے زمانہ میں حضرت کی عنایات حاصل رہیں؛ البتہ حضرت کے وصال ہوجانے کی وجہ سے صحیح بخاری آپ نے حضرت مولانا سید فخر الدین احمد مرادآبادیؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند سے پڑھی، اور حضرت کی خاص توجہات وعنایات بھی آپ کو حاصل رہیں، مولانا مدنی رحمہ اللہ کے وصال کے بعد آپ نے حضرت مولانا اسعد مدنی رحمہ اللہ سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کیا۔

دورۂ حدیث شریف میں جن اساتذہ سے آپ نے حدیث کا درس لیا اس کی تفصیل اس طرح ہے، صحیح بخاری حضرت مولانا فخر الدین احمد مرادآبادی، صحیح مسلم وجامع ترمذی حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، سنن ابوداود حضرت مولانا سید فخر الحسن، سنن نسائی حضرت مولانا بشیر احمد صاحب بلندشہری، سنن ابن ماجہ اور موطأ امام مالک حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب قاسمی، طحاوی شریف حضرت مولانا ظہور احمد دیوبندی، شمائل ترمذی حضرت مولانا سید حسن دیوبندی، موطأ امام محمد حضرت مولانا محمد

جلیل صاحب کیرانوی اور حضرت مولانا سید حسن صاحب دیوبندی سے مشترکہ طور پر پڑھیں۔

فراغت کے بعد دارالعلوم میں دوسال مزید علوم وفنون کی تکمیل کی، علم ہیئت آپ نے امام فن مولانا بشیر احمد صاحب سے پڑھی، تین سال جامعہ طبیہ دیوبند میں طب کی تعلیم حاصل کی، طب کی کتابیں حکیم محفوظ علی خان اور حکیم محمد عمر صاحب سے پڑھیں، طبیہ کی تعلیم کے دوران شیخ القراء قاری حفظ الرحمٰن صاحب سے حفص سے سبعہ تک قراءات پڑھیں اور فن تجوید حاصل کیا، اس طرح مادر علمی میں آپ نے کل نو سال گذارے۔

آپ کے رفقائے درس میں حضرت مولانا ریاست علی بجنوری، مولانا رشید الدین حمیدی، مولانا محمد مسلم صاحب اعظمی (والد ماجد مفتی محمد راشد صاحب اعظمی) مولانا جمیل احمد اعظمی (والد ماجد مولانا عارف جمیل صاحب مبارکپوری) وغیرہ شامل ہیں۔

حضرت مولانا سے راقم الحروف کا تعلق

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ہمارے گھرانے سے حضرت مولانا کی متعدد قریبی رشتے داریاں تھیں، ہمارے گھرانے بلکہ گاؤں میں وہ حافظ ماموں کے نام سے یاد کیے جاتے تھے، ذکر ان کا بارہا سنا تھا؛ لیکن جیسا کہ یاد پڑتا ہے کہ دیدار پہلی بار دارالعلوم دیوبند میں اس وقت ہوا، جب ہم 2000ء میں داخلہ کے لیے دارالعلوم پہنچے، قد کافی پستہ، بدن ہلکا پھلکا، چہرہ پُر جلال وخوبصورت، داڑھی لمبی، گھنی اور گھنگھریالی، دو پلی ٹوپی، سادہ اور صاف ستھری وضع، آواز دھیمی، چال ڈھال میں چاق چوبند اور مستعد، اپنا تعارف کرایا، تو خیر خیریت دریافت فرمائی، اور داخلہ امتحان کے مناسب کچھ ہدایات دیں، اللہ کے فضل سے سال ہفتم میں داخلہ ہوگیا، ملاقات ہوئی، تو بہت خوشی کا اظہار فرمایا، ہفتم ثالثہ میں نام آیا، تو حضرت سے وہاں مشکاۃ المصابیح کا آخری حصہ پڑھنے کی سعادت ملی، گاہے گاہے حضرت کے یہاں بھی آنا جانا رہا، امتحانات میں نمبرات اچھے آتے رہے، اور تکمیلِ ادب وافتاء میں داخلہ ملتا گیا، جس کی وجہ سے حضرت مولانا بڑی شفقت اور محبت کا معاملہ فرمانے لگے، ان کا رعب اُنس میں تبدیل ہوتا گیا، بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتے، بالکل گھل مل جاتے، اور پرانے واقعات، کھیت، کھلیان، باغ اور گاؤں گھر کے قصے بڑی دلچسپی سے سناتے، کوئی مشورہ لیا جائے تو بڑے اہتمام سے بات سنتے اور مشورہ دیتے۔

جب میں تکمیلات میں پہنچا تو حضرت نے کئی بار مجھ سے فرمایا کہ تم دارالعلوم میں معین مدرسی کے لیے درخواست ضرور دینا، اس سے تجربہ بھی ہوگا اور تمہاری صلاحیت بھی اساتذہ کے سامنے آئیں

گی تو کام کرنے کے اچھے مواقع بھی پیدا ہوں گے؛ مگر طبیعت اس طرف مائل نہ ہوسکی، مولانا یہ بھی فرماتے تھے کہ جو پڑھنا ہے پڑھو؛ مگر جب تعلیم ختم کرنے کا ارادہ ہو تو آگے کے لیے مشورہ ضرور کرنا؛ چناں چہ حسب حکم جب تعلیمی سفر ختم کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت کے پاس مشورہ کے لیے حاضر ہوا، دو ایک جگہوں سے اشارے ملے تھے، حضرت سے اس کا ذکر کیا؛ مگر حضرت کی رائے ہوئی کہ مدرسہ شاہی چلے جاؤ، یہ نام میرے لیے اپنی حیثیت سے بہت بڑا معلوم ہوا؛ مگر حضرت نے اطمینان دلایا، شاہی کے بعض ذمہ داروں سے بات بھی کی، اور ایک زوردار سفارشی تحریر بھی مدرسہ شاہی کے مہتمم صاحب کے نام لکھی، جو میری تمام تر نااہلی کے باوجود میرے لیے ایک وقیع سند کا درجہ رکھتی ہے، مولانا نے لکھا:

باسمہ تعالی

محترم جناب مہتمم صاحب مدرسہ شاہی مراد آباد زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محترم مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے کبھی کسی کی سفارش بلامکمل جانکاری اور اعتماد کلی کے کی ہو، مولوی اجمل سلمہ میرے شاگرد ہونے کے علاوہ دارالعلوم دیوبند آنے کے بعد سے مجھ سے بہت قریب رہے، اور ضروری مواقع پر مشورہ لیتے رہے، میں اعتماد کرتا ہوں کہ موصوف مدرسہ شاہی کے لیے ہر اعتبار سے مفید سے مفید تر ثابت ہوں گے۔

محمد احمد غفرلہ

۱۶، ۱۰، ۳۰ھ

بہرحال حضرت مولانا کی یہ تحریر، اور اسی کے ہمراہ استاذی حضرت مولانا نور عالم امینیؒ استاذ ادب دارالعلوم دیوبند کی ایک وقیع سفارشی تحریر مدرسہ شاہی میں راقم الحروف کے تقرر کے لیے کافی سمجھی گئی اور ان کے بعد کسی انٹرویو وغیرہ کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

کچھ نصیحتیں

میں مدرسہ شاہی کے لیے روانہ ہوا تو مولانا نے چند نصیحتیں کیں (۱) فرمایا: مولوی صاحب! آپ ہمیشہ ''کار خود کن کار بے گانہ مکن'' کے اصول پر عمل کیجیے، اپنی ذمہ داریوں اور امور مفوضہ کو پوری مستعدی اور امانت داری سے انجام دیجیے اور دوسرے معاملات میں بالکل دخل نہ دیجیے، ان شاء اللہ عافیت سے رہیں گے۔ (۲) فرمایا: ہم نے سختی کے ذریعہ طلبہ پر قابو پایا؛ لیکن اب سختی

اور مار پیٹ کا زمانہ نہیں رہا، طلبہ پر ترغیب وتشویق اور دلجوئی کے ذریعہ قابو کیجیے اور مار پیٹ کو سب سے آخری درجے پر رکھیے۔ (۳) ذمہ داروں سے تعلق اور رابطہ رکھیے؛ مگر نہ اتنا قریب رہیے کہ لوگ آپ کو خاشامدی سمجھیں، اور نہ دوری اختیار کیجیے کہ ذمہ داروں کو کسی غلط فہمی کا موقع ملے۔ (۴) طلبہ سے جسمانی خدمت لینے سے کامل پرہیز کیجیے، کسی نوعمر طالب علم کو تنہا اپنے کمرے میں نہ آنے دیجیے، اگر ضرورت ہو تو یا تو کمرے کے باہر جا کر اس سے بات کیجیے، یا اس کے ساتھ کچھ اور طلبہ بلا لیجیے، تہمت اور فتنے کی جگہوں سے احتیاط بہت ضروری ہے۔ مولانا کی یہ باتیں میرے لیے بڑی چشم کشا اور مفید ثابت ہوئیں۔

ایک بار کہا کہ تم دیوبند نہیں آتے، میں نے عرض کیا حضرت مجھے سفر سے بڑی وحشت ہوتی ہے، بس مجبوری میں ہی سفر کرتا ہوں، مجھے دیوبند نہ آنے پر شرمندگی کا احساس ہے، فرمایا: میرے استاذ مولانا ضیاء الحق صاحب فرماتے تھے کہ مولوی صاحب! مدرسی نام ہے پیر کٹوا کر بیٹھ جانے کا، کامیاب مدرس وہی ہے جو جم کر بیٹھ جائے، اور ناغہ نہ کرے، سفر نہ کرنا مدرس کے لیے اچھی بات ہے۔ ایک دفعہ میں اپنے بعض حالات کی وجہ سے کافی الجھن میں مبتلا تھا، ملاقات کے وقت استفسار پر اس کا اظہار کیا، فرمایا: اَلْخَیْرُ فِیْمَا وَقَعَ، ان شاء جو ہوا اسی میں بہتری ہوگی، پرانی بات بھول جائیے اور جم کر کام کیجیے، مولانا کی اس بات سے مجھے بہت تسلی ملی۔

وفات

اوپر گذرا کہ مولانا نے کم وبیش دارالعلوم میں ۲۸ سال خدمات انجام دیں، اخیر میں جب آپ کی صحت خراب رہنے لگی تو آپ صفر ۱۴۳۹ھ میں تدریسی خدمت سے ازخود مستعفی ہوگئے؛ حالاں کہ اساتذۂ دارالعلوم میں سے آپ کے بعض بہی خواہ حضرات کا مشورہ تھا کہ آپ استعفیٰ نہ دیں، جو ہو سکے پڑھا دیں، باقی تکمیل کوئی کردے گا؛ مگر حضرت مولانا کا کہنا تھا کہ جب میں کام نہیں کروں گا تو تنخواہ کس بات کی لوں گا، بلاشبہ یہ حضرت کے غایت درجہ تدین کی دلیل ہے، تدریس سے مستعفی ہونے کے بعد آپ دارالشفاء، دارالعلوم دیوبند میں یونانی معالج کے طور پر خدمات انجام دینے لگے، مگر جلد ہی خرابیٔ صحت کی وجہ سے اس سے بھی مستعفی ہوگئے۔

گذشتہ چند سالوں سے آپ بیمار چل رہے تھے، درمیان میں بہت زیادہ علالت کی خبریں آرہی تھیں اور افاقہ بھی ہو جاتا تھا؛ یہاں تک کہ وقت موعود آگیا اور ۸۷ سال کی عمر میں (قمری اعتبار سے ۹۱ سال میں) آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور جان جانِ آفریں کے سپرد کردی، ۲۵ فروری

۲۰۲۴ء مطابق ۱۴ شعبان المعظم ۱۴۴۵ھ بروز اتوار صبح نو بجے دیوبند میں اپنے مکان میں آپ نے وفات پائی اور تدفین قبرستانِ عابدی میں مسجد عابدی کے سامنے قبرستان کی پوربی سمت میں ہوئی، راقم الحروف کو بھی جنازہ اور تدفین میں شرکت کی سعادت حاصل رہی، اللہ تعالی آپ کی مغفرت فرمائے، درجات بلند کرے، اور جنت الفردوس آپ کا مسکن بنائے آمین!

اولاد

مولانا کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں حیات ہیں، بیٹے مولانا شفیع الرحمٰن، حافظ مطیع الرحمٰن، مولانا حبیب الرحمٰن ہیں، سب خودکفیل اور صاحب اولاد ہیں، آخرالذکر نے مولانا کی صحت و بیماری کے زمانے میں جو بے لوث خدمت کی وہ بے مثال، قابلِ رشک اور لائقِ تحسین ہے، اللہ تعالی دنیا وآخرت میں اس کا اپنے شایانِ شان اجر عطا فرمائے آمین! ایک بیٹے جو سب سے بڑے اور لائق فائق تھے، عین جوانی میں انتقال کر گئے، بڑی بیٹی بھی ابھی کچھ ماہ پہلے وفات پا گئیں، اللہ ان مرحومین کی مغفرت فرمائے! آمین!

❊ ❊ ❊

حضرت مولانا حکیم محمد احمد فیض آبادیؒ
مسافرانِ آخرت میں شامل

از: مولانا محمد منظور امین
اسعد نگر ملواباڑ میرراجستھان

رب کریم کی کرم گستری کے طفیل (2011) میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ امتحان میں شریک ہونے اور کامیابی سے سرخ رو ہونے کی سعادت میسر آئی، اپنی قسمت پر ناز ہے کہ ہفتم پڑھنے کا اعزاز اس دارالحدیث فوقانی میں حاصل ہوا، جس کے در و بام نے نہ جانے کتنی مرتبہ حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جیسی عبقری شخصیات کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا، گھنٹے، اسباق اور کتب کی تقسیم کے بعد تین چار سو طلبہ کی جماعت میں بالکل اخیر کی تین چار تپائی پر جگہ لینے میں کامیاب ہوا، سبق میں حاضری کے پہلے دن خوشی و مسرت کے جذبات کے ساتھ۔ صبح کے دورانیے میں چار گھنٹے مختلف اساتذۂ گرامی قدر کے پاس پڑھے، شام کے پہلے گھنٹے میں شرح عقائد کا سبق پڑھنے کے بعد تعلیمی آخری گھنٹے میں ہدایہ رابع سامنے کھول کر حضرت اقدس مولانا محمد احمد صاحب فیض آبادی نور اللہ مرقدہ کی آمد کا سراپا شوق بن کر انتظار کی گھڑیاں گننے لگا، کچھ دیر بعد قدرے کم قامت، ہلکا جسم، سر پر دو پلی ٹوپی، آنکھوں پر بڑا گول سا عینک، آنکھوں سے ٹپکتی ذہانت و ذکاوت، پیکرِ تواضع حضرت الاستاذ مسندِ درس پر جلوہ افروز ہوئے، یہ حضرت کی پہلی زیارت تھی، کتاب سامنے رکھ دی گئی، کسی طالب علم نے عبارت خوانی کا شرف حاصل کیا، دھیمی آواز میں سبق کی شان دار تشریح کرنے کے ساتھ ہر مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی، ان کا درس خالص علمی ہوتا تھا، وہ درس گاہ میں حاضر ہونے سے قبل سبق کی مکمل تیاری، اور پورے انہماک کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے؛ اس لیے ان کا درس معلومات افزا ہونے کی وجہ سے طلبہ میں کافی مقبول تھا، وہ دورانِ درس مزاحیہ گوئی، لطیفہ

سنجی، قصہ سرائی کے بالکل مخالف تھے، سبق کے اختتام کے بعد طلبہ ان سے رقعہ لکھ کر علمی سوالات کرتے، حضرت الاستاذ ہر پرچے میں لکھے سوال کا تسلی بخش جواب دیتے، ان کو فقہی جزرسی میں دست رس حاصل تھی، وہ درس میں پوری سنجیدگی اور وقار کے ساتھ بیٹھتے، پورے طلبہ پر یک ساں نظر رہتی تھی، اتنی بڑی تعداد میں ہر طالب علم پر کڑی نظر رکھنا ان کا خاصہ تھا، اگر کسی طالب علم کو درس سے غافل، کتاب سے کھیلتے، یا ادھر ادھر نظر گھماتے دیکھ لیتے، اس دن اس کی شامت آجاتی، اس کو اپنے پاس بلا کر گوش مالی کرنے کے ساتھ گدی پر تھپڑ بھی رسید کرتے، وہ طلبہ کے تئیں زیادہ شفقت کے قائل نہیں تھے؛ لیکن بیجا متشدد بھی نہیں تھے، ہر چھوٹے بڑے طالب علم کی غلطی پر گرفت کرنے، اور اس پر واجبی سزا دینے میں وہ کبھی نرمی نہیں برتتے تھے، امتحان ہال میں آنکھیں دوچار کرنے والے طلبہ کو ان کا تھپڑ مارنا، جوابی کاپیاں سوخت کرنا، اور ہال سے باہر نکالنے کا منظر ابھی آنکھوں کے سامنے گردش کررہا ہے۔

حضرت الاستاذ بڑے اصول پسند انسان تھے، ان کے یہاں قانونی پاسداری اور ضابطے پر عمل داری کا عملی نمونہ پایا جاتا تھا، اصول کی خلاف ورزی اور قانون شکنی سے بے حد کلفت محسوس کرتے، قوانین پر عمل درآمد اور دستور العمل کی بجاآوری میں انھوں نے کبھی کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہیں کی، وہ اصول وضوابط سے سرمو انحراف کرنے کے جواز کے قائل نہیں تھے، انھوں نے ہمیشہ اصول وضوابط کے تحت جینا سیکھا، ان کی اس اصول پسندی کو دیکھتے ہوئے انھیں دارالعلوم میں ثانویہ کا ناظم تعلیمات منتخب کیا گیا، نظامت کا عہدہ سنبھالتے ہی مستحکم ومضبوط تعلیمی لائحہ عمل طے کیا، اور اس کو سختی سے نافذ العمل کرنے میں رات ودن ایک کردیا، صبح وشام کے تعلیمی اوقات میں طلبہ کی حاضری لینے کے ساتھ اساتذہ پر کڑی نظر رکھنے لگے، ہر روز بلا ناغہ گھنٹہ لگتے ہی صدر دروازے کے پاس کھڑے ہوکر تاخیر سے پہنچنے والے طلبہ کی سرزنش کرتے، جو اساتذہ دیری سے کلاس میں پہنچتے، ان سے باز پرس کرتے اور وقت پر حاضر ہونے کی ہدایات دیتے، ان کے اس طرز عمل سے طلبہ واساتذہ بروقت درس گاہ میں حاضر ہونے کے عادی ہوگئے تھے، ماہانہ امتحان کا سلسلہ شروع کیا، جس سے تعلیمی ڈھانچہ مضبوط سے مضبوط ترین ہوتا گیا، طلبہ کی تعلیمی وتربیتی میدان میں اپنے لاغر جسم کو خوب پگھلایا، طلبہ کی وضع قطع اور نشست وبرخاست پر پوری نظر رکھتے، گاہے گاہے طلبہ کے بال چیک کرتے، خلاف سنت بالوں کو سر دست کٹوا دیتے، طلبہ ان کی اس اصول پسندی اور تعلیمی وتربیتی حوالے سے ان کی سختی اور شدت پسندی کو برا مانتے تھے؛ لیکن جس فیروز بخت طالب علم نے حضرت

الاستاذ کی سختی اور ڈانٹ ڈپٹ کا کڑوا گھونٹ بہ رضا دل وجان سے پی لیا، اور اس کی اپنی زندگی میں بہ خوشی سہ گیا، وہ ان شاء اللہ تازیست کام یابی وکام رانی کے منازل طے کرنے میں اپنے معاصرین میں امتیاز کا حامل ہوگا، ان کا دور نظامت بہت سنہرا اور قابل تعریف رہا، دارالعلوم کی انتظامیہ اور مجلس شوری نے ان کی حسن کارکردگی پر ہمیشہ خوشی کا اظہار کیا، ان کی انتظامی صلاحیتوں کے سب معترف ہوئے۔

حضرت الاستاذ کی پیدائش ۹ رنومبر ۱۹۳۷ عیسوی پریتم پور، ضلع فیض آباد، موجودہ ضلع امبیڈکر نگر یوپی میں ہوئی، آپ کے والد ماجد کا نام حاجی عبدالرحمٰن تھا، ابتدائی تعلیم اپنے وطن مالوف میں مکمل کی، عربی تعلیم کے لیے مدرسہ فرقانیہ گونڈہ، اور مدرسہ ضیاء العلوم مانی کلاں ضلع جون پور میں داخل ہوکر بڑی جاں فشانی کے ساتھ طلب علم کا سفر جاری رکھا، اعلی تعلیم کے لیے از ہر ہند دارالعلوم دیوبند کے لیے کوچ کیا، وہاں ۱۳۷۳ ہجری سے ۱۳۷۸ھ تک مختلف اساطین علم وفن سے علم حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، اس کے بعد مزید دگر فنون میں محنت شاقہ سے مہارت حاصل کی، پھر طب یونانی سے اشتغال کا سلسلہ شروع کیا، اپنی محنت ولگن سے طب یونانی میں بڑا امتیاز حاصل کیا، اس کے بعد مختلف مدارس اسلامیہ کو اپنی علمی جولان گاہ بنا کر سیکڑوں طالبان علوم نبویہ کو اپنے علم وعمل سے مستفید کرتے رہے، ان کا تعلیمی وتربیتی شہرہ دور دراز علاقوں تک پھیلا؛ بل کہ عالم گیر ہوا، ان کی علمی قابلیت کی وجہ سے ۱۴۱۱ ہجری میں وہ دارالعلوم دیوبند جیسی معیاری درس گاہ میں مدرسہ شاہی مرادآباد سے بہ حیثیت عربی استاذ مدعو کر لیے گئے، اس وقت سے تا ۱۴۳۹ ہجری مختلف کتابوں کا درس ان سے متعلق رہا، وہ بڑی کام یابی اور نیک نامی کے ساتھ اپنے تدریسی مشغلے میں لگے رہے، یہاں تک کہ ۱۴۳۹ھ میں انھوں مختلف عوارض کی وجہ سے درسی ذمے داریوں سے سبک دوشی حاصل کر کے بہ طور معالج دارالشفا میں خدمت دینے کا سلسلہ شروع کیا، آپ ایک کام یاب تجربہ کار یونانی طبیب تھے، اللہ نے آپ کو دست شفا عطا کیا تھا، آپ بڑے نبض شناس تھے، دور دراز سے لوگ آپ سے علاج ومعالجہ کے لیے آتے، اور آپ کے تجویز کردہ نسخوں سے شفایابی پاتے، بعد نماز عصر طلبہ و شہری لوگوں اور اطراف دیوبند سے مریضوں کی بھیڑ آپ کے دولت خانہ پر موجود رہتی، آپ سب کو چیک کرتے، اور مرض کا علاج تشخیص کر کے دوا دیتے۔

آپ چوں کہ بڑے اصولی آدمی تھے، طلبہ کی غلطیوں پر بروقت روک ٹوک اس کی اصلاح کرنا ان کا امتیاز تھا؛ اس لیے طلبہ ان سے دوری بنائے رکھنے میں ہی عافیت سمجھتے تھے، اور ان کے پاس

آنے جانے سے بہت کتراتے تھے، اور نہ وہ خود طلبہ کو اپنے گھر بلانے کے عادی تھے، عاجز ایک مرتبہ بعد نماز عصر اپنے ہم ضلع طالب علم کے ساتھ جس کو گیس کے ساتھ قبض کی شکایت رہتی تھی گیا تھا، حضرت الاستاذ مسجد چھتہ کے پیچھے واقع دارالمدرسین میں قیام پذیر تھے، کئی لوگ علاج کے لیے موجود تھے، آپ کے اردگرد یونانی دوائیاں بکھری پڑی تھی، باری باری سب کو چیک کیا، اور ایک پرچے میں دوائیاں لکھ کر اور ان کے طریقہ استعمال کو اپنے فطری کرخت انداز میں بتاتے ہوئے احتیاطی غذائی چیزوں سے مکمل پرہیز کرنے کا حکم صادر فرماتے رہے، حضرت نے عاجز کے ہم وطن طالب علم کی نبض و پیٹ دیکھ کر کچھ دوائیاں تجویز کی، ہم نے وہاں سے جلد نکلنے میں اپنی عافیت محسوس کی۔

حضرت استاذ محترم چار پانچ سال سے بیمار چل رہے تھے، علاج و معالجہ سے کچھ افاقہ بھی ہوجاتا تھا؛ لیکن وقت موعود آپہنچا تھا؛ اس لیے ہر تدبیر پر تقدیر غالب آگئی اور ۱۴؍شعبان ۱۴۴۵ھ مطابق ۲۵؍فروری ۲۰۲۴ء بہ روز اتوار حضرت الاستاذ سفر آخرت پر روانہ ہوگئے، جہاں سے کوئی لوٹ کر واپس نہیں آیا، إنا للّٰہ و إنا إلیہ راجعون، اللہ حضرت الاستاذ کی مغفرت کاملہ فرمائیں اور ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائیں!

* * *

نئی کتابیں

(۱)

سب سے آسان ترجمہ قرآن مجید
قرآن فہمی کے لیے سنگِ میل

==========

ترجمہ نگار : ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند
تعارف نگار: مفتی اشرف عباس قاسمی، استاذ دارالعلوم دیوبند
ناشر: مکتبہ ادیب دیوبند 9027498192

==========

قرآنِ مقدس کتاب ہدایت ہے، اس کا درست فہم ہی وہ بنیاد ہے جس پر اسلامی تعلیمات کی عمارت استوار ہے، کلام خداوندی کو اس کے صحیح تناظر میں سمجھنا، اس کی مرادیں متعین کرنا، پس منظر اور پیش منظر کے لحاظ سے اس کا مدعا واضح کرنا یہ وہ بنیادی ذمہ داری ہے جس کا ادراک علماء کو اول روز سے رہا ہے؛ اس لیے ہر دور کے علمائے کرام نے اپنے دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے قرآنی تعلیمات کے فہم کو عام انسانوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے، قرآن مجید کے تراجم انھیں کوششوں اور ذمہ داریوں کی انجام دہی کا آئینہ دار ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ ایک طبقہ روایتی علماء پر اس حوالے سے طعن کرتا ہے کہ انہوں نے قرآن کریم سے عوام کو دور رکھا؛ جب کہ تراجم کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو روایتی علماء کرام ہی صف اول میں نظر آتے ہیں۔

دنیا کی مختلف زبانوں میں تراجم قرآنی کی ایک پوری تاریخ رہی ہے، ہمارے برصغیر میں شاہ

ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اوران کے خانوادے نے قرآن مجید کے متن سے براہِ راست جڑے اور تراجم کی روایت کو باقاعدہ تحریک کی صورت میں عام کیا، شاہ ولی اللہ صاحب جیسے بابصیرت انسان نے خاص طور پر آنے والے وقت کی فضا کو بھانپ لیا تھا، اوراس میں راست طریقے پر متن قرآن سے وابستگی کی اہمیت کومحسوس کرلیا تھا، شاہ صاحب فتح الرحمٰن کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''آج ہم جس زمانے میں ہیں، اور جس ملک (برصغیر ہندوستان) میں رہتے ہیں، مسلمانوں کی خیرخواہی کا تقاضہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کا ترجمہ سلیس فارسی زبان میں روزمرہ محاورہ کوسامنے رکھتے ہوئے کیا جائے۔ جس کی عبارت ہرقسم کے تصنع، بناوٹ اورخودنمائی سے پاک ہواوراس میں قصص و واقعات اور غیرضروری توجیہات وتشریحات کے بجائے آیات کا ترجمہ پیش کیا جائے؛ تاکہ عوام و خواص یکساں طور پراسے سمجھیں، اورچھوٹے بڑے ایک ہی نہج پراس کا شعور حاصل کریں۔''

شاہ صاحب نے اس ضرورت کے تحت خود بھی اس وقت کی رائج فارسی زبان میں ترجمہ کیا، اور اپنے وابستگان میں بھی اس فکر کو عام کیا؛ چناچہ آپ کے صاحبزادگان شاہ رفیع الدین علیہ الرحمہ اور شاہ عبدالقادر علیہ الرحمہ نے اردو ترجمے فرمائے، پھر جب زمانہ آگے بڑھا، فکر ولی اللّٰہی دیوبند کی صورت میں اپنے برگ و بار لے آئی تو تراجم کا ایک حسین سلسلہ شروع ہوگیا، ہر بدلتے وقت میں تبدیلیوں کومحسوس کیا گیا اوراس کی رعایت کے ساتھ ترجمے تیار کیے گئے، تراجم میں عصری ضرورتوں کا خاص لحاظ رکھا گیا، پیشِ نظر ترجمۂ قرآن بھی اسی سلسلے کے ایک کڑی ہے، مترجم معروف صاحبِ قلم اورمحقق عالم دین، ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد قاسمی استاد دارالعلوم دیوبند ہیں، جنھیں اللہ پاک نے ترجمے کے لیے ضروری علوم عربیہ پر دسترس کے ساتھ اردو زبان وادب کا بھی خاص ذوق عطا کیا ہے۔ قرآن مقدس کی تفسیر اور ترجمے سے خصوصی مناسبت ہے، اور آسان سے آسان راہ اپنا کر ترجمہ قرآنی تک رسائی کے لیے کامیاب نئے طریقے وضع کررکھے ہیں؛ حتی کہ جوطلبہ آپ سے نیازمندانہ علمی تعلق رکھتے ہیں آپ ان کونحووصرف کے موٹے موٹے قواعد بتلاکر سرعت کے ساتھ قرآن کریم کا مکمل ترجمہ یادکرادیتے ہیں؛ بلکہ بعض دوسرے مدارس جنھوں نے اس نہج کواپنایا ہے، ان کا تاثر یہ ہے کہ اس نہج سے طلبہ میں بہت جلد ترجمے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔

''سب سے آسان ترجمے'' کی ضرورت کیوں پیش آئی خود حضرت مترجم کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں، آپ فرماتے ہیں:

''اکابر کے قابلِ اعتماد تراجم پرایک دوصدی گزرچکی ہے، ان میں عربی اور فارسی کے الفاظ

بہت ہیں، محاورات میں آج کا قاری اجنبیت محسوس کرتا ہے، اگر چہ اس زمانے کی یہ فصیح زبان ہے، جب فارسی کا چلن تھا، عربی مفردات سے عوام واقف تھے؛ اب زبان بدل چکی ہے، مفردات نئے آ گئے ہیں، ترکیبیں نیا روپ دھار چکی ہیں؛ اس لیے ایسا ترجمہ کیا جائے جو تفسیر کے منہجی خطوط پر استوار ہو ساتھ ہی عربی فارسی کے مشکل الفاظ اس میں نہ ہوں، ترکیبیں آج کی ہوں، ایسے الفاظ بھی نہ ہوں جن سے ایک علاقہ مانوس اور دوسرا غیر مانوس ہو''

اگر چہ یہ طے کر دینا کہ اس جملے یا لفظ کا سب سے آسان ترجمہ یہی ہے، آسان نہیں؛ بلکہ مشکل ہے، تاہم مترجم موصوف نے اس حوالے سے جس عرق ریزی اور تتبع واستقصا سے کام لیا ہے، اس کے پیشِ نظر بہت حد تک وہ اپنے مقصد اور منہج میں کام یاب نظر آ رہے ہیں۔ یہ بات قاری پر اس وقت کھلتی ہے جب وہ چند مشکل آیتوں کا انتخاب کر کے معاصر تراجم کا تقابلی مطالعہ کرتا ہے، اس وقت اندازہ ہوتا ہے کہ مترجم نے آسان ترین مفردات ومحاورات کے لیے کتنی عرق ریزی کی ہے؟

مترجم نے پورے شرحِ صدر کے ساتھ اس اہم کام کا بیڑا اٹھایا اور اپنے اس کام کی بنیاد اکابر علماء کے تراجم پر رکھی، آپ فرماتے ہیں:

''چنانچہ علامہ جرجانی اور شاہ ولی اللہ کے فارسی ترجمے؛ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے اردو ترجمے کتب خانۂ دارالعلوم دیوبند سے حاصل کیے، ان کے ساتھ اکابر کے پندرہ تراجم تک رسائی ہوگئی؛ یعنی ترجمۂ شیخ الہند، حقانی، تھانوی، دریابادی، فتح محمد جالندھری، احمد لاہوری، احمد سعید دہلوی، سرفراز خان صفدر، اکرم اعوان، عبدالقیوم مہاجر مدنی، عاشق الٰہی بلند شہری، صوفی عبدالحمید سواتیؒ، محمد تقی عثمانی، خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہما اور مفتی صاحب کی ہدایت القرآن کے لفظی ومحاوری ترجمے؛ اس طرح انیس قابل اعتماد تراجم کے لفظ لفظ اور حرف حرف پر غور وفکر کرنے کا حوصلہ لے کر بیٹھا، ان میں پانچ تراجم کو ناچیز ام التراجم تصور کرتا ہے، یعنی حضرت شاہ ولی اللہ، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر دہلوی، حضرت تھانوی اور فتح محمد جالندھری کے ترجمے؛ اس لیے کہ بعد کے سارے ترجمے انھیں کو سامنے رکھ کر تیار کیے گئے ہیں۔''

کن خطوط پر ترجمہ کو آگے بڑھایا گیا، کام کی نوعیت کیا رہی، ترجمہ میں کس قدر محنت وجانفشانی سے کام لیا گیا ہے اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''کام کی نوعیت یہ رہی کہ پہلے قرآن پاک کے ایک لفظ کے سارے ترجمے دیکھتا اور انھیں ایک کاغذ پر جمع کر لیتا پھر ان میں سے آسان ترجمے کا انتخاب کرتے ہوئے درج ذیل عربی تفاسیر

میں سے متعدد یا سب کو دیکھتا؛ تفسیر جلالین، کبیر، ابن کثیر، ابن عاشور، قرطبی، طبری، بغوی، مدارک، سعدی اور زمخشری؛ ساتھ ہی عربی لغات سے مدد لیتا، ان میں لغات القرآن، المعانی (انٹرنیٹ)، المعجم الوسیط، القاموس الوحید، مصباح اللغات قابل ذکر ہیں؛ جب مفردات کے انتخاب پر مطمئن ہوجاتا تو اُسے اردو لغات میں دیکھتا؛ اس کے لیے فیروز اللغات، جامع اللغات، فرہنگ آصفیہ اور انٹرنیٹ پر موجودہ چند لغات سے مدد لیتا اور جو لفظ کئی بار آیا ہے اس کو سارے مقامات پر دیکھتا اور سارے معانی کو جمع کرتا اور ہر جگہ کے مناسب معانی پر غور کرتا؛ پھر محاورات کو دیکھتا اور ایسی آسان تعبیر اختیار کرتا جس سے زیادہ آسان پر میں قادر نہیں، جسے ہر وہ اردو پڑھنے والا سمجھ سکے، جو اخبار پڑھ لیتا ہے اور جو تعبیر اردو حلقے میں ہر جگہ سمجھی جاسکے اور صرف ونحو سے بھی صرف نظر نہیں کیا؟ اس مرحلے میں بہت سی جگہوں میں غور وفکر میں پورا پورا دن لگ گیا؛ بلکہ کئی کئی دن صرف ہوگئے۔''

اس طرح محنت شاقہ اور اور طویل فکر وتدبر کے بعد یہ آسان ترین ترجمہ منظر عام پر آسکا ہے، جس کے ذریعے ایک اہم ضرورت کی تکمیل اور مایۂ ناز محدث ومفسر، مخدوم گرامی حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد پالن پوری قدس اللہ سرہ وبرد مضجعہ، شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کے امر کی تعمیل بہ حسن وخوبی ہوتی نظر آرہی ہے۔ مفتی صاحب موصوف، حضرت مفتی سعید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے خصوصی تربیت یافتہ قابلِ فخر تلمیذ رشید ہیں اور آپ کے انتہائی معتمد اور منظور نظر رہے ہیں اور حضرت والا کے طے کردہ رہنما خطوط پر ہی اس منصوبے کو انجام تک پہنچایا ہے۔ ترجمہ کی اشاعت پندرہ سطری حافظی قرآن مجید میں کی گئی ہے؛ تاکہ حفاظ علماء کو ترجمہ تلاشنے میں آسانی ہو اور تلاوت کرتے وقت آیات کے مضمون ومفہوم کی طرف بھی ذہن مبذول ہوتا رہے، تلاوت کا لطف دوبالا ہوتا رہے اور اقبال کی زبان میں تلاوت کرنے والے کے ضمیر پر نزولِ کتاب ہوتا رہے۔

میں دل کی گہرائیوں سے اس خدمت گرامی پر مترجم محترم کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور طبقہ اہلِ علم، طلبۂ مدارس اور عامۃ المسلمین سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ قرآن فہمی میں اس گراں قدر ترجمے سے ضرور فائدہ اٹھائیں! ربّ کریم حضرت مولانا کی اس کاوش کو بے انتہا قبول فرمائیں اور اس کو خوب افادیت ونافعیت عطا فرمائیں!

❋ ❋ ❋

(۲)

نام : رفتگانِ نارفتہ
مصنف : حضرت مولانا نور عالم خلیل امینیؒ
استاذ ادب عربی ورئیس تحریر ماہ نامہ ''الداعی'' عربی، دارالعلوم دیوبند
صفحات : ۷۰۴
اشاعت : ۱۴۴۲ھ=۲۰۲۱ء
ناشر : ادارہ علم وادب دیوبند (+919520255550)
تعارف نگار : ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند
==========

دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز ادیب کی یہ آخری تصنیف ہے، جو ان کی وفات کے بعد منصۂ شہود پر آئی جس کی پیشانی پر علامہ اقبال کا یہ شعر ہے:

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شام زندگی، صبحِ دوام زندگی

موت بظاہر شام ہے؛ مگر یہ حقیقت میں آخرت کی دائمی زندگی کی صبح ہے، حضرت چلے گئے؛ مگر اُن کے کارنامے باقی ہیں، ان کا ذکر خیر چلتا رہے گا، یہی مطلب ہے ''رفتگانِ نا رفتہ'' کا، اس میں ایسی شخصیات کا ذکر ہے جو بظاہر مر گئے؛ مگر اُن کے کارناموں نے انھیں زندہ رکھ رکھا ہے۔ جب بھی کسی شخصیت کی رحلت ہوجاتی تو حضرت ان کا تحقیقی خاکہ عربی یا اردو یا دونوں میں تیار کرتے اور شائع کرتے، پیشِ نظر مجموعہ چوبیس مشاہیر اہل علم کو اپنے اندر لیے ہوے ہے، اس کی خوبیاں بہت ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں: (۱) اس میں اختصار کے ساتھ پوری شخصیت کا احاطہ کیا گیا ہے۔ (۲) مواد تحقیقی ہے، مصنف جس کے عادی تھے اور بڑی محنت کیا کرتے تھے (۳) ہر شخصیت کی امتیازی خوبیوں کو نکھار کر زیب قلم کیا گیا ہے۔ (۴) شخصیت سے اپنی وابستگی اور والہانہ تعلقات کو بیان کرنے سے دریغ نہیں کیا گیا ہے۔ (۵) منظر نگاری جو مصنف کی ممتاز خوبی ہے، اس سے خاکے مزین ہیں، وہ قارئین کو خوب لطف دیتے ہیں۔ (۶) املانویسی کے اصول وضوابط اور رموزِ اوقاف کی خوب پابندی کی گئی ہے؛ تاکہ نئی نسل اس سے سبق حاصل کرے۔ (۷) تعبیرات کو پرشکوہ کرنے کا ملکہ مصنف میں خوب تھا، سارے خاکے اس خوبی سے مزین ہیں، مصنف کا حلقہ باذوق قارئین کا

ہے، انھیں اس مجموعے میں خوب لطف ملے گا۔ یہ اپنی نوعیت کا لاجواب بیانیہ ہے۔ کتابت، طباعت، کاغذ، ٹائٹل اور دیگر سارے ظاہری ومعنوی اوصاف دیدۂ قلب ونگاہ کو کھینچنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبولیت سے نوازے!

* * *

(۳)

نام کتاب : حیات قطب الہند حضرت منورویؒ
تالیف : حضرت مفتی اختر امام عادل قاسمی (نبیرۂ حضرت منورویؒ)
صفحات : ۱۰۲۴ (دوجلد) اشاعت : ۱۴۴۲ھ=۲۰۲۱ء
قیمت : ۱۳۰۰ روپے
ناشر : دائرۃ المعارف الربانیہ جامعہ ربانی منورواشریف، سمستی پور (بہار)
ملنے کا پتہ : مکتبہ النور، دیوبند
تعارف نگار : ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند

==========

اردو ادب میں ''سوانح'' غیر افسانوی فن پارے کی وہ قسم ہے جس میں شخصیت سے متعلق ہمہ جہت تفصیلات سلیقے سے مرتب کی جاتی ہیں، ولادت سے وفات تک کے جملہ نشیب وفراز، کمالات اور ساری خدمات ذکر کی جاتی ہیں۔ سوانح کی امتیازی خوبیاں تین بتائی گئی ہیں؛ مواد، ترتیب اور اسلوب؛ اگر سوانح میں مواد خوب ہو، زندگی کو اعتدال سے رقم کیا گیا ہو، کوئی گوشۂ زندگی تشنہ نہ ہو اور ترتیب فطری ہو ولادت سے وفات تک کی تفصیل تسلسل کے ساتھ بیان ہوئی ہو، خدمات وآثار کو بھی مناسب ترتیب سے بیان کیا گیا ہو اور انداز بیان میں فصاحت وبلاغت ہو یعنی معانی، بیان اور بدیع میں بیان کردہ خوبیاں موجود ہوں تو سوانح جاندار ہوتی ہے، کلاسیکی ادب میں اس کو مقام دیا جاتا ہے۔

میرے سامنے حکیم سید احمد حسن منورویؒ کی سوانح ہے، موصوف کے پوتے نے ترتیب دی ہے، یہ بارہ ابواب پر مشتمل ہے، اس کے مواد کی یکجائی اور ترتیب میں مفتی اختر امام عادل قاسمی مدظلہ نے بیس سال لگائے ہیں، شخصیت کے علوم ومعارف، اوصاف وکمالات، تصانیف، خلفاء، قیام مدارس وخانقاہ اور کرامات سب کو اکٹھا کیا ہے، اسی کے ساتھ بہار میں خانقاہوں کی تاریخ، خانقاہوں میں کتب خانے، سمستی پور (شمس الدین پور) کی علمی وادبی تاریخ، منورواشریف کی تاریخ اور اس کی

علمی واصلاحی خدمات؛ سب کو نہایت سلیقے سے لکھا ہے، اس سے پہلے اپنے پردادا مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوریؒ کی کلیات اور سوانح مرتب فرما چکے ہیں اور یہ دادا محترم کی سوانح ہے، موصوف کو سوانحی تحریر مرتب کرنے کا سلیقہ بھی خوب ہے جس طرح یہ علمی، فقہی اور ادبی تحریر لکھتے ہیں اسی طرح سوانح بھی خوب لکھتے ہیں۔ یہ سوانح اپنے مواد، اسلوبِ بیان اور ترتیب ہر لحاظ سے معیاری اور کلاسیکی ہے، اسے پڑھ کر بہت سی معلومات سامنے آئیں جن سے راقم حروف ناواقف تھا، موصوف نے صاحب سوانح کی تین تصانیف کا بھی تعارف کرایا ہے، جن میں نقشبندی تینتیس (۳۳) اور چشتی چھبیس (۲۶) شخصیات کا تعارف کرایا گیا ہے، اس میں مریدین کو اذکار واشغال اور مراقبہ کی تعلیم دی گئی ہے، ساتھ میں شجرات بھی ہیں، اسی کے ساتھ سوانح نگار نے شخصیت کی تصنیف ''شیخ احمد سرہندی'' کی تحقیق وتعلیق کا کام بھی کیا ہے، اس پر وہ مزید مبارکباد کے مستحق ہیں، ان تینوں تصانیف کو بھی اس سوانح میں شامل فرمایا ہے، اس میں موصوف نے پچھلی تصنیف مثلاً ''کلیاتِ آہ'' میں بعض درآمد غلطیوں کی اصلاح کے حواشی بھی لکھے ہیں۔ (ص۹۳) ایک اور خوبی یہ نظر آئی کہ موصوف نے حواشی کے نمبرات کتاب کے شروع سے اخیر تک مسلسل رکھے ہیں کل نوسو پچیس حواشی ہیں اور دونوں جلدوں کے صفحات کی ترتیب بھی مسلسل ہے۔

سوانح اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں سے آراستہ ہے، کتابت، طباعت، کاغذ وغیرہ سب دیدہ زیب اور بارونق ہے، اللہ تعالیٰ اُسے قبولیت سے نوازیں!

❊ ❊ ❊

(۴)

نام کتاب : مولانا عبدالستار معروفیؒ: حیات وخدمات

مرتب : قاری محمود عالم بلیاوی مدظلہ استاذ جامعہ حسینیہ لال دروازہ، جون پور

صفحات : ۳۵۹ اشاعت اوّل: ۲۰۲۲ء

ناشر : مولانا محمد سلمان محمود قاسمی بلیاوی 9415892074

تعارف نگار : ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند

==========

پورہ معروف ضلع مئو (یوپی) کا معروف گاؤں/قصبہ ہے، جہاں بہت سی تاریخی، علمی عبقری شخصیات پیدا ہوئیں، ان میں مولانا عبدالستار بن قاری ظہیرالدین بن رحیم بخش بھی ہیں، موصوف

کے دادا ''احیاء المعانی'' کے مصنف ہیں، پورا گھرانہ علمی ہے، مولانا نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد متعدد مدارس میں خدمات انجام دیں، اخیر میں جامعہ حسینیہ جون پور میں انتیس سال خدمت کی، ابتداء سے متوسطات تک کی کتابیں پڑھاتے تھے، منطق، فلسفہ، ادب عربی اور تفسیر سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے موصوف کی عمر اور انفرادیت کی وجہ سے وہاں طلبہ اور اساتذہ ''دادا'' کہتے تھے، ذی الحجہ ۱۴۴۲ھ کو انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت قاری محمود عالم بلیاوی زید مجدہٗ نے موصوف کا خاکہ مرتب فرمایا ہے اور ان کے فرزند ارجمند جو ابھی چند سال پہلے دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوے ہیں انھوں نے کتابت وتزئین کے بعد شائع کیا ہے۔

اس مجموعے میں متعدد شخصیات کے تاثرات اور مخلصانہ احساسات رقم ہیں ان میں نمایاں شخصیت دارالعلوم دیوبند کے استاذ حضرت مولانا محمد نسیم بارہ بنکوی مدظلہ ہیں، ان کو مولانا عبدالستار معروفی سے شرف تلمذ حاصل ہے، یہ اُن کے بڑے مداح ہیں، اس مجموعے میں کوشش کی گئی ہے کہ موصوف کی تحریریں بھی شامل ہوجائیں چنانچہ متعدد علمی وادبی افادات اس میں قارئین کو نظر آئیں گے، اردو اور عربی شاعری کا نمونہ بھی ملے گا، تصانیف کا تعارف اور خطوط بھی جو متعدد متعلقین اور احباب کو لکھے تھے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائیں، خدمات کو قبول فرمائیں اور ان کی زندگی پر لکھا گیا مجموعہ قبولیت حاصل کرے۔ کتابت، طباعت، ٹائٹل اور تزئین کاری سب پرکشش ہے۔

* * *